

Osmania University Library

Call No. 191/5/1/1

Accession No. 1020.

Author

2-F

Title

0, 10

This book should be returned on or before the date last marked below.

اساتذہ کرام کا تحفہ (۱۵)

مشورہ

مشاہیر اردو کے خیالات کا مجموعہ

مرتبہ

مولوی سید منظر علی صاحب

باہتمام محمد مفتی غلام غفرانی

مطبع انسی ٹیوٹی گٹ میں طبع ۱۹۱۶ء

(اردو میں سے شائع ہوا)

سلسلہ یادگار مولانا اشہری صاحبِ حرم نمبر ۲

يَا قَوْمَنَا اَجِبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ

مشورہ

اخلاقی اور تاریخی مضامین کا مجموعہ

مشورہ

محرم کی چاند رات۔ از مولانا اشہری مرحوم حسین اوصاف سازی۔ از حضرت ریاض بناری
کلام فصیح۔ از خان بہادر شاہ مدظلہ باعیات شہیر۔ از جناب شہیر محمد علی شہری مدظلہ
میراج شہادت۔ از خان بہادر مولوی سید خیرات احمد مدظلہ بادکھستان تلافی!

بادشمنان مدارا!!

(مرتبہ مولوی سید منظر علی صاحب)

باہتمام محمد مقتدی خاں شروانی

انسٹیٹیوٹ پریس علی گڑھ میں طبع ہوا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مشورہ

ایک ایسی قوم جس میں جناب رسالتؐ کی زبان جناب امیرؑ کا ہاتھ اور حضرت امامؑ کا دل کام کر رہا ہو، لازمی طور پر زمانہ کی رفتار سے سبق حاصل کر سکتی ہے۔ اور ہماری قوم نے بھی زمانہ کو شریک کرنے کی غرض سے انھیں مقدس روحوں کو اپنے لئے آفتاب ہدایت بنایا ہے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ جو قوم اپنے انتہائے مصائب میں بھی غمی اور غمی طور پر ہر زمانہ میں اپنے معاصرین سے پیش رہی ہو اُس کا انتشار اب اس قدر ترقی کر جائے کہ اُسے خود اپنے جمود کی خبر نہ ہو، اُس کے مشاہیر کے ہاتھ اپنی قوم کی صلاح کے لئے کوتاہ ہوں اور اُس کے افراد کو قطع نظر کر کے جب مجموعی طور پر دیکھا جائے تو حالت بد سے بدتر نظر آئے۔

کوئی قوم اُس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ اپنی مدد آپ نہ کرے اور کسی قوم کی ترقی کی امید اُس وقت تک فضول ہے جب تک کہ اُس کے افراد کو اپنی ترقی کا خود خیال نہ ہو۔ اسی طرح کسی قوم کی قلت اس امر کی منع نہیں ہو سکتی کہ جو نعمتیں خداوندِ عالم نے عطا فرمائی ہیں یا جن خوبیوں کو باوہی برحق نے تعلیم فرمایا ہے، اُن کے حاصل کرنے کے بجائے وہ خود کو ایسا ناکارہ کرے کہ دنیا کی کوئی قوم اُس سے زیادہ پست نظر نہ آئے۔ ہم ایک ایسی کشتی پر ضرور سوار ہیں جس کا ناخدا بیدار ہے اور لنگر اپنی جگہ پر قائم مگر کیا یہ غلط ہے کہ اُس کشتی کے تختوں کو ہم خود اپنے ہاتھ سے کاٹ رہے ہیں ؟

یہ چند سطریں جنکو ہمارے ناظرین نے اوپر پڑھا ہے وقت تحریر ہوئی تھیں کہ ہم مسئلہ کی

دوسری ششماہی اور سالِ حال کی پہلی سہ ماہی میں اُس وقت کا لحاظ کر کے، گویا اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں کو بسترِ عیالات پر کاٹ رہے تھے۔ اور کیسے اُمید تھی کہ ہم اس ناکام خیال کو کہ قوم کی روح کم از کم سال میں بارہ مرتبہ تازہ کیجاتی رہے، عملی صورت میں دیکھ سکیں گے؟ آپ یہ سمجھئے کہ وہ ایک وقت کا خواب تھا، جس کی تعبیر ناکامی، نکلی۔ مگر خدا را ایک منٹ کو بھی یہ نہ خیال فرمائے کہ ہماری اس آواز میں کوئی اثر نہ تھا اور اس صدا پر لبیک کہنے والا تمام مملکت ہند میں کوئی نہ نکلا۔ ہماری کروڑوں کی مردم شماری میں ہزاروں نہیں تو سیکڑوں ایسے بیدار دل ضرور نکل آئے جنہوں نے ہماری آواز کا جواب دیا۔ مگر کچھ اسباب تم جنہوں نے ہمیں اس دریائے محبت میں شناوری کرنے سے باز رکھا یا کوئی قوی سبب ایسا حائل ہو گیا جس کی وجہ سے ہم اپنے خیال کو عملی صورت نہ دیکے۔

مشورہ کیا ہوتا؟ اس کا جواب دینا بہت بعد از وقت ہے، تاہم آپ اُن چند مضامین سے جنہیں ہم اس مجموعہ میں درج کرتے ہیں اندازہ فرما سکیں گے کہ ہم اور ہمارے ہم قلم حضرات کسطح اپنی قوم کے مختلف المذاق اور مختلف الخیال لوگوں کے دماغوں پر اثر ڈالنا چاہتے تھے۔ کوئی کلام نہیں کہ یہ رنگ مشورہ میں نہایت گہرا نظر آتا مگر صرف اسی رنگ پر ہمارے خیال کی بنیاد نہ تھی۔ ہم سیاسیات سے قطع نظر کر کے تمام دنیا اور کرہ ارض پر بسنے والی تمام ترقی یافتہ قوموں کے انتہائی سبق کو اپنے ناظرین کے سامنے پیش کرتے۔

ہمارے ایک ہنجیال جو رسالہ کے روح و رواں کا کام دیتے اپنے ایک خط میں تحریر کرتے ہیں: ”مشورہ کا تو نام بھی اب بھول گیا ہوں اور صلاح یہ ہے کہ ہر دماغ اُسے فراموش کر دے البتہ قوم کی قسمت پر رویا مگر اُس کا حاصل“؛

گلیمِ بختِ سہ را کہ بافتند سیاہ
بہ آبِ زمزم و کوثر سفید نتواں کرد

ہم بھی غالباً ان الفاظ کی تائید کرتے مگر رحمتِ ایزدی سے مایوس نہیں ہیں۔ کیا عجیب ہے

کہ بیمارے اس یوسفِ گم گشتہ کی تلاش میں دبوڑھی زلیخا کی جگہ، کوئی جوان دل یعقوب نکل
 کھڑا ہو، جو ہم سے زیادہ اس کام کا اہل ہوگا۔ فی الحال تو آپ اس خیال پر فاتحہ خیر پڑھیں
 مگر جن سطروں کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے ان کو ایک بار پھر دیکھ جائیں کہ قوم کے اندر روح
 پیدا کرنے کے لئے یہ بھی کافی ہوگی۔

حیدرآباد دکن۔ یکم شوال ۱۳۳۳ھ

سید منظر علیؒ

محرم کی چاند رات

(از افاضات مولانا سید امجد علی صفا شہری نور اللہ مرقدہ)

خُن آشنا نگاہ ہو! تمہیں جلن ہوش ربائے ازل کی قسم ذرا عرش لایزال کی طیف بکھنا کر پڑ
 قدس کی چلن کیوں بے اختیار راہی جاتی ہے عشق آشنا نگاہ ہو! تمہیں طرہ لیلائے سواد شام کی قسم
 کسی کی پھیلن ترانیوں کو بھول کر اونچی نگاہ سے دیکھو کہ گوشہ افق کے شفقی رنگ میں کس کا
 خم ابرو نظر آ رہا ہے۔ تم ابراہیم نہیں کہ ہزار بی پکار تے پھر دوسری جیسے عاشق اور ہوں گے
 کہ لاکھنہ لرنی، پرلن ترانی، سنا کئے۔ تم اُس قدرت احد کے دیکھنے والے ہو جو ہر وقت ہمتا کے
 سامنے ہے، اور اُس عاشق معشوق مزاج پیغمبر کے شاگرد ہو جو کون ازل نے خود کھینچا ہے۔ لیکن
 ہر جا وہ شریعت رکھتا ہے اور ہر دل کو عرفان کی ضرورت ہے۔ اگر آنکھیں ہیں تو دیکھو اور جب
 وہ ہے تو تمہیں اپنے قریب ہی ملیگا۔ اندھیری رات میں معشوق کو یاد کر کے اور دو چار دفعہ
 اٹھ بیٹھ کر امید وصال پر سو رہنا اور چہرے اور روز روشن میں اُس کی رضا پر قتل میں جھومتے
 چلے آنا اور بات۔

گزرِ منزلِ تسلیم و رضا مشکل ہے سہل ہے عشقِ بشر، عشقِ خدا مشکل ہے
 جنکے رتبے ہیں سوا اُن کو سوا مشکل ہے وعدہ آساں ہے، وعدہ کی وفا مشکل ہے

یہ فقط امر ہو فاطمہ کے جانی سے

مشکلیں جتنی پڑیں کاٹیں سب سانی سے

یہ وہ مقناطیسی کشش ہے جو معشوق کو عاشق کی طرف کھینچ لاتی ہے اور یہ وہ دلکش اداس ہے جو

مشوق سے عاشق کے ناز اٹھواتی ہے۔

صاحبو! کیا دیکھتے ہو آج محرم کی چاند رات ہے اور ایک حقیقت پناہ کفن بردوش جھوٹا چلا آتا ہے۔ وہ دو قدم بڑھتا ہے، جذبِ حقیقی چار قدم کھینچتی ہے۔ یہ دیکھ کر وہ دوڑنے لگتا ہے کہ جذبِ مطلوب کو تکلیف نہ ہو۔ حُسنِ ازل بھی اپنا خود آرا جمال اور اپنے طالب کا استقلال دیکھنے اور دکھانے کو آمادہ ہے۔ ارواحِ انبیا کو چھیڑ دیا گیا ہے کہ جناب موسیٰ و ادی امین اور کوہِ طور جیسی لاکھوں چنگاریاں اُڑتی دیکھ لیں جناب ایوبؑ اُس کے اور اپنے صبر کا مقابلہ کریں۔ حضرت ابراہیمؑ غور کریں کہ اُنھوں نے بفرمانِ ایزدی کتنی پٹیاں آنکھوں پر باندھ کر بیچ فرزند کو ہاتھ بڑھایا اور وہ کس طرح دولہا کو کوفی بیل اللہ نذر کرنے کے لئے حاضر ہے۔ حضرت عیسیٰؑ خیال فرمائیں کہ اکیلے صلیب پر چڑھے اور یہاں تمام کنبہ برہمنیوں کی نوک پر ہے جناب یعقوبؑ نے گیارہ لڑکے سانسے ہونے پر یوسفؑ کی گم گشتگی سے رو رو کر آنکھیں اندھ می کر لیں اور وہ کس استقلال سے تمام کنبہ کو راہِ خدا میں پیش کر رہا ہے۔ الحاصل وہ اپنے سچے جوش سے تمام ہمراہیوں کو فنا فی اللہ کے مقام پر کھینچنے لے جاتا ہے۔

صاحبو! دو دن کی بات اور ہے، دوسرے دن اس مسافر کو وہیں دیکھا۔ اب ذرا آسمان پر نگاہ کرو اور چاند دیکھو۔ مسلمانو! متواتر دو عیدوں کی خوشیاں منا چکے، اب ذرا دل تھاپنے ہوئے ہمارے ساتھ چلو۔ ہم کیا کہیں تم خود دیکھ لو گے کہ حُسنِ ازل کے کتنے پردے اُٹھتے اور گرتے ہیں، اور جلوۂ ابد کے کتنے کرسٹے منہ دکھاتے اور چھپاتے ہیں۔ ہاں! ذرا آنکھ بند کر کے وہ وقت یاد کرو کہ رسولِ اکرم صلیعہ علیہ السلام کن مصائبِ مکہ چھوڑ کر مدینہ گئے تھے، اور امام حسین علیہ السلام کس آفت سے مدینہ چھوڑنے کا قصد کر رہے ہیں۔ کوذ و شام کے سیاسی خطوط نے وہ چھیڑ نکالی ہے کہ بنے نکلے بن نہیں آتی۔ سفر کا سامان تیار ہو چکا ہے۔ پچھلی رات سے زفقائے مرنی دروازے پر جمع ہیں کہ امامِ عالمیت کو رخصت کریں، فصحاءِ عرب سچیں ہیں کہ دو دمانِ رسالت کے کوچ پر خطباتِ مبلغ کس سے سنیں گے، اوبائے حجاز بیتاب ہیں کہ

آفتاب کی تنویر ذرہ میں اور دریا کا نمونہ قطرہ میں دکھانے والا خدا نمان جاتا ہے۔ پتھری کی بجائے
 عیون و محمد پر پڑ رہی ہیں، نوجوان قاسم و علی اکبر کو دیکھ رہے ہیں۔ شجاعانِ عرب تلوار پر ٹیک
 ٹیک کر جناب عباسؑ کو تاک رہے ہیں کہ آج اس فخر بنی ہاشم کا ساتھ اُن سے چھوٹا ہے۔
 درِ دولت پر یار و انصار بکمریں کس کر بیتار لگا رہے ہیں۔ محل کسے جاتے ہیں، پردے کا
 اہتمام ہو رہا ہے۔ عوراتِ مدینہ رخصت کو چلی آتی ہیں۔ گھر میں کُہ لام مچا ہے۔ جناب صغرا کی
 حالت دلچسپی نہیں جاتی۔ علی اصغرؑ کا گہوارہ باہر نکالا گیا ہے۔ حضرت گھر میں جا کر جناب
 صغراؑ کے پاس بیٹھے ہیں کہ نعرہٗ حق علیٰ خیر العمل نے پھر اُٹھا دیا اور سپیدہٗ سحر میں نیلی
 دھاریاں دیکھ کر مسجدِ نبویؐ کو روانہ ہوئے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایسے وقت میں اُس
 برگزیدہٗ امام کا مسجد میں نماز پڑھنے کو جانا اور نانا کے روضہ سے رخصت ہونا کس قیامت
 کی تصویر پیش کرتا ہوگا! اے رسول کے رتبہ شناسو! دیکھو کہ بعد نماز اُس نے کس طسوج
 اپنے ناما سے فنا فی اللہ کے مقام پر قدم بڑھانے کی اجازت چاہی ہے۔ وہ روضہٗ نبویؐ
 پر زیارت پڑھ کر سر جھکائے اہل مسجد سے مصافحہ کرتا ہوا باہر نکلا ہے جس کی یاد سے
 مدینہ کے درو دیوار بہتے نظر آتے ہیں۔ آفتاب کی کرن دیکھتے ہی اُس نے حرمِ محترم
 کے نافے بڑھوائے ہیں، عزیز و انصار کا پر اُن کے ساتھ ہے اور سب کے بعد رخصت
 کرنے والوں کے لئے دعائے خیر کر کے گھوڑے پر سوار ہوا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ یہ قافلہ کہاں جاتا ہے؟ مکہ، کہ خدا کے گھر پہنچ کر پناہ پائے۔
 قافلے والے وہاں پہنچ کر احرام باندھ چکے ہیں کہ پرچہ پالیوں نے حجاج کے ہمیں میں اشرار
 کے درپے قتل و گرفتاری کی خبر دی۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں احرام باندھ کر چوٹی کی کوئیں
 ستائے مگر فرزندِ رسول صبح کے لئے یہ تیاریاں ہو رہی ہیں! خانہ کعبہ (جو اُسکے باپ کا مہولہ
 ہے، نہیں چاہتا کہ فرزندِ رسول صلعم کے خون سے اُس کے درو دیوار رنگین ہوں۔
 اللہم نیردانی کہہ رہے ہیں کہ عرفات میں دوڑنے کے لئے یہ لاکھوں آدمی کافی ہیں۔

حُرن ازل نے وصلِ فصل کے مقامات دکھانے کے لئے حجبِ عرفان اٹھائے ہیں۔ نورِ عرفان نے نلی مع اللہ کے جلوے دکھانے شروع کئے ہیں۔ ایک طرف زمین مکتہ پکڑے ہی کہ یہاں رہو، دوسری جانب ارض کر بلا کیسٹج رہی ہے کہ ادھر آؤ۔

محمد ابن حنفیہ نے سمجھایا ہی کہ آپ کو ذکا قصد نہ فرمائیں، آپ کے لئے عین جانا بہتر ہوگا مگر آپ نے فسخِ عزم نہیں کیا، اور حرمِ محترم سے رخصت ہو کر مع اہل و عیال جان بچا کر روانہ ہوئے ہیں۔ راہ میں زرارہ بن صالح نے بھی ایسا ہی عرض کیا ہے لیکن اُس باکشت جوش کار کنا امکان سے باہر ہو چکا تھا۔ آگے بڑھ کر کوذ کا ایک سا فرما ہے جس نے مسلم دہانی کی نہایت غمناک خبر سنائی ہے مگر استقلالِ اجازت نہیں دیتا کہ فسخِ عزم فرمائیں۔ غرض دوسری محرم کو خیامِ امامت ارض کر بلا پر نصب ہو گئے ہیں۔ چھٹیوں تک عمر ابنِ خولیٰ، حصین ابنِ نمیر، شرفی الجوشن، سنان ابنِ انس، اشعب وغیرہ سردارانِ کوذ و شام کی فوجوں نے راستے روک دیئے ہیں، پانی کے گھاٹ بند ہیں۔ اب آگے چل کر گھسان کی لڑائی ہونے والی ہے جو قیامت تک صفحہ ہستی پر یادگار رہے گی۔

اشہری! یہ لوگ دنیا میں رہیں گے یادگار

اب نہ پیدا ہوں گے ایسے ساجد و پرہیزگار

ہاں! اب تم شوق سے اس المناک جہنم کا چاند دیکھو مگر یہ یاد رہے۔

بوددہ روز۔ سالے، سوئم این دانہ افشانی

بغفلت مگذراں بے گریہ ایامِ محترم را

کلام فصیح

منتخبہ جناب خان درمولوی سید محمد صفا شاد ظلہ رئیس

میرزا جعفر علی فصیح جن کی ولادت اودھ کے مرقوم خیزدار الحکومت میں واقع ہوئی تھی اس شہر کے شرفائے تھے اور میرزا صاحب کے آبا و اجداد کو لکھنؤ اور دہلی میں معزز فوجی خدمات سپرد تھے۔ انکی زندگی کا ایک بڑا حصہ حجاز و عراق کی مسلح سرزمین پر گذرا اور آخری سانس تک معطلہ کی ارض پاک میں نکلی جہاں وہ اپنی عمر کے چند سال بسر کر چکے تھے۔ گذشتہ زمانہ میں جہاں اور مشاہیر فراموش کر دئے گئے تھے میرزا فصیح کے حالات بھی تاریکی میں رہے، مگر ہم حضرت شاد ظلہ کے ممنون ہیں جنہوں نے اپنی کتاب ”ذکر خیر“ میں دلگیر، ضمیمہ، خلیق، دبیر اور انیس کے بعض اہم سوانح کے ساتھ فصیح کے حالات کو بھی حوالہ قلم کیا ہے۔ ہمیں اس کتاب کے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب جلد یا بدیر اہل ملک کے ہاتھوں میں پہنچے گی۔

اس کے ساتھ ہی ہم حضرت شاد ظلہ کے الفاظ میں یہ عرض کر دینا مناسب قہ خیال کرتے ہیں کہ میرزا فصیح فلسفہ معرفت الہی، تصوف اور تسلیم و رضا کے مضامین سخن گسترانہ بیان فرماتے ہیں بلکہ ان مضامین کو پوری طرح باخبر لوگوں کے مانند افراط سے لاتے ہیں۔ اور امام علیہ السلام کے معتاد و شہادت انہیں پر مبنی ہیں۔ ہمارے مرثیہ گو یوں کو چاہیے کہ مضامین ذیل پر غور کریں اور اپنے کلام میں بیشتر ایسے ہی مضامین داخل فرمائیں جن سے خدا پرستی، معرفت اور تسلیم و رضا کے مسائل کی طرف عام و خاص تھکیں اور ائمہ اہلبیت کی شان ظاہر ہو۔

ایک مرثیہ میں حضرت سید الساجدین اور اہلبیت المہار کا قید ہو کر کو ذہین داخل بیان کیا ہے۔ امام غلہ زنجیر و طوق میں جکڑے ہوئے ہیں۔ گلا فکا رہے پنڈلیوں میں زخم پر پٹھے ہیں۔ اور

خون جاری ہے۔ امام کا پانچ برس کا صاحبزادہ (امام محمد باقرؑ) ہمراہ ہے۔ باپ کی مصیبت دیکھی
 نہیں جاتی۔ کبھی پنڈلیوں کو ہاتھ سے پکڑ لیتا ہے کبھی طوق کو انگلیوں سے سنبھالے رکھتا ہے کہ
 زخم زیادہ نہ پھیلیں کبھی باپ کا منہ یاں محسوس سے لگتا ہے اور بیقرار ہو جاتا ہے کبھی ظالموں کی
 طرف ہلک کر دیکھنے لگتا ہے۔ امام علیہ السلام بیٹے کی ہتھیلی دیکھ کر یوں تعلیم فرماتے ہیں یہ
 کماؤ کے باپ نے اے پسر! تو امام زادہ ہے صبر کر یہی ذلتیں ہیں شرف ترا۔ نہ ملو ہو منو چشم تر
 اسی زندگی میں تو ہے مراد کہ جو موت ہے شدید تر نہیں سرکٹنے میں برتری۔ نہیں ناگوار وہ اس قدر
 ہمیں ہر نفس دم تیغ ہے۔ ہمیں ہر قدم پہ جہاد ہے

یہی درد اپنی پسند ہے۔ یہی بیخ اپنی مراد ہے

یہ خدا کا فضل ہے صبر کر۔ یہ قرب بھی فوز عظیم ہے نہ تو ذلیل و حقیر ہے۔ نہ پدر علیل و مقیم ہے
 یہ تفصیلات کریم ہے۔ یہ عطائے رب رحیم ہے دل داغ دار تو باغ ہے۔ یہ عوم باد نسیم ہے
 نہ یہ زخم کھانے میں ہر مزا نہ حلاوتیں ہیں یہ حربیں
 کہیں کیا جوتی ہیں لذتیں۔ ہمیں تازیانوں کی ضربیں

یہ جوتے تن ہر دوک رہا۔ یہ بدن جو دھوپ لالہ یہی دل کی عین مراد ہے۔ کہ یہ اپنا جاہ و جلال ہے
 ہر جو ضعف و غش کی زیادتی یہی اپنا فضل و کمال ہے رخ زرد و دیدہ خون فشان یہی اپنا من و جال ہے
 یہ ہے دستہ سنبل تازہ کا۔ سر دست میں جو ہمار ہے

نہیں سسلے ہیں یہ بدعیاں یہی طوق پھولوں کا ہار ہے

یہ جو حرف تلخ ہیں گوش زد یہ لذیذ ترین نباتات یہی تشنگی ہے عزیز تر۔ سمجھا کہ آب حیات سے
 کیا شکر بھوک میں چھ گھڑی۔ ہر زیادہ صوم و صلاوہ ہے مجھے بحر اشک سے فیض ہے نہیں بہرہ آب فراست ہے
 مجھے تلخ گوئی شمر میں۔ جو مزا ملا ہے عجیب ہے

شہد اکو کب دم تیغ میں۔ یہ مزا یہ ذوق نصیب ہے

بجھا کہ پاؤں کا آبلہ مجھے تاج سر سے زیادہ ہے یہ غلش جو اس میں ہر خار کی۔ مرادل تگفتہ و تاشا ہے

یہ ہوا کی تند جو چلتی ہے۔ بخدا کہ بادرُمد ہے اسی قیدِ ظلم میں ہر نفس۔ مرنے والے صرف جہاد ہے

میں قدم قدم پہ شہید ہوں۔ میں نفس نفس میں قتل ہوں

نہ اسیر ہوں نہ مریض ہوں۔ نہ سقیم ہوں نہ صیل ہوں

یہ خدا کا مجھ پہ کرم ہوا۔ کہ جہادِ نفس ہوں کر رہا یہ بڑا جہاد ہے اے پسر! کہ میں پہلے موت کے مر رہا

نہ جسد رہا نہ نفس رہا۔ نہ نشان رہا نہ اثر رہا نہ ہوا رہی نہ ہوس رہی۔ نہ تو دل رہا نہ جگر رہا

نہ خار رہی نہ تقار رہی۔ جو رہا تو نامِ قدیر کا!

نہ ہو مضطرب کہ ہر تو خلف۔ بخدا شہید کبیر کا!

بیمیاں اہل کو فہ سے فرماتی ہیں :-

ہوئیں راہِ حق میں جو ذلتیں۔ ہیں عزتوں سے زیادہ ہیں قید ہونیکا غم نہیں۔ کہ خوشی سے محرم و شام ہیں

ہیں کی ہیں جو جو جھوٹیں۔ شہ بیگناہ وہ یاد ہیں ہیں درد و رنج پسند ہیں۔ جو اسیرِ ابنِ زیاد ہیں

کریں ظالموں کو جو بد دُعا۔ تو دوبارہ جوشِ تنور ہو

کوئی حرفِ شکوہ ادا کریں۔ تو جہاں میں شورِ لشکر ہو

تھیں کیا خبر نہیں کو فیو! کہ بنی کی آل ہیں ہم حزیں ہیں نبی کی عزتِ طاہرہ۔ ہیں نباتِ سیدہ مرسلین

ہوئے ہم اسیر تو کیا ہوا۔ نہ فقیر ہیں نہ تباہ دیں ہمیں کپڑے اپنے نہ لاکے دو۔ یہ تصدقاتِ روانہ ہیں

صدقہ حرام ہے آل پر۔ ہمیں مالِ خمس حلال ہے

ہمیں اس کا لینا روا نہیں۔ یہ طریقی اہلِ خیال ہے

غیرت دارِ بیمیاں اپنے بچوں کی جانب یوں خطاب فرماتی ہیں!

کہنا بچوں سے یوں پکار کر۔ نہ یہ میو کی کھائیو لاؤ۔ یہ ترش ہیں تلخ ہیں خام ہیں۔ انہیں دکر و انہیں پیکید

یہ حرام ہیں! یہ زبون ہیں۔ میری جان! ہاتھ میں بھی نہ کرو صبرِ خلد سے حوریٰں چلیں لیکے میوؤں کو خوان کو

کوئی دم میں فاطمہ آئیگی۔ تمہیں پاس اپنے بلائیگی

تمہیں میو کے کھلائیگی۔ تمہیں وادی پانی پلائیگی

نہیں دیر دیکھو تو تم اُدھر۔ وہ کھلا بہشتِ بریں کا دریا وہ شجر ہیں میوؤں کے بارور۔ وہ جنت
وہ لے ہیں خواہ مخواہ حوریاں۔ وہ رسول آتے ہیں فرما کر وہ مہتماری دادی ہیں فاطمہ۔ وہ خدا

وہ علی نے مشک کو پر کیا۔ وہ حسن نے جام کو بھر لیا

وہ بنی نے خوانِ طعام کو۔ سر جو خسلد پہ دھر لیا

اہلبیتِ طاہرہ کے سعادتمند بچوں کی حالت حضرت سکیکینہؓ کی زبان سے

سنا جب صغیروں نے یہ سخن۔ تو وہ میوے پھینک کے روڈ یہ سکیکینہ بولی کہ لے پھوپھی! میرے دل کو تو

میں تمہارے منہ کی بلائیں لوں۔ مجھی معصیت بچا لیا مجھے بابِ خلد دکھا دیا۔ وہ کھڑے ہو

مری دادی میوے وہ لاتی ہیں سیکر بابا جان وہ آتے ہیں

مرے دادا خلد میں ہیں کھڑے۔ مجھے پاس اپنے بلاتے ہیں

معراج شہادت

(انجناب خان بہادر مولوی سید خیرات احمد صاحبناظر نے کیل گیا)

جناب خان بہادر مولوی سید خیرات احمد صاحب رئیس وکیل گیا (صوبہ بہار) ہماری قوم کے ان عالی حوصلہ اور قابل قدر تقلید بزرگوں میں ہیں جنہوں نے کسی وقت خود کو محفل و بیکار نہیں رہنے دیا اور ہمیشہ قومی و مذہبی خدمات کیلئے مشہور و معروف ہے۔ زمانہ وکالت کے دماغ سوز ایام میں بھی آپ قوم و مذہب کے یادگار خدمات بجالایا کئے اور جبکہ عمر و علالت نے استراحت آرام کے لئے اصرار کیا تو آپ نے جمیع اشغال سے کنارہ اور ہر طرف سے بے نیازی حاصل کر کے صرف اپنے دیرینہ فطری شوق خدمات قوم و مذہب سے واسطہ رکھا اور اسی کو اپنا زاد آخرت بنالیا! ”معراج شہادت“ بھی ان ہی مبارک ایام کا ایک قابل لحاظ اور یادگار مضمون ہے جس نے ہماری موجودہ ضروریات میں سے ایک بڑی ضرورت کو پورا کر دیا۔ ہم دست بدعا ہیں کہ خداوند عالم اس باہمت و عالی نفس بزرگ کو تا دیر چارے سردوں پر قایم رکھے کہ ہمارے دوسری قومی ضروریات اس ذات والا صفات سے پورے ہوا کریں۔ آمین!!

اس مضمون میں جہاں پر ذکر حضرت خڑا اور شہادت حضرت مسلم و اخبارات کو ذکر کیا بیان کر کے امام علیہ السلام کے غم و غصہ پر بحث اور جن لاجواب دلائل سے اُس کی رد کی گئی، ہر وہ نجات لطف جناب خان بہادر کی ہو (اہلیہ مشرید سلطان احمد ڈپٹی لیگل ریمبرنسر بنگال) کے دماغ ذہن کا نتیجہ ہے جس سے امتیاز ہو سکے گا کہ ہمارے گھروں میں بھی یہ ذکر کس طرح جاری و ساری رہا کرتا ہو اور اس سے آئندہ کیسے عمن و اہم نتائج مترتب ہو سکتے ہیں۔ نیز یہ کہ بایں لاپرواہی ہماری عورات کے قوائے دماغی اب تک اتنے ہیں کہ اگر انہیں باقاعدہ تعلیم و تربیت دی جائے تو آج بھی

گاہوں گاؤں میں ملکہ رضیہ اور رابعہ بصری پیدا ہو سکتی ہیں !!
 اعتراض۔ بعض لوگ جناب امام حسین علیہ السلام پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت نے دیدہ
 دانستہ اپنے کو ہلاکت میں ڈالا اور اس سے نعوذ باللہ حکم خدا
لَا تَلْقَوْا يَدَيْكُمَا إِلَى الْهَلَكَهٖ
 کی نافرمانی کی۔ اور بعض کہتے ہیں کہ آپ بطمع خلافت کوفہ گئے اور وہاں فوج مخالفین میں گم گئی
 اور نعوذ باللہ اپنی نمرائے اعمال کو پہونچے۔

کیا یہ بات صحیح ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے آپ کو تنہا میں ڈالا؟
 جواب۔ سبحان اللہ! جناب امام حسین علیہ السلام کی کیا شان پاک ہو کہ دشمن کہتی ہی ہو
 اُن کے نور پاک پر ڈالیں حضرت کا نور چمکتا ہی جائیگا۔ آپ ان اعتراضات کے جواب سنئے
 کہ حضرت نے از ابتدا اتنا حکم حاکم حقیقی اور رضائے پروردگارِ عالم کا اس قدر خیال فرمایا
 ہی کہ طاقتِ بشری سے باہر ہے اور اس میں قیل وقال کی کہیں جگہ باقی نہیں ہے۔

پہلے اعتراض کی نسبت ذرا واقعات پر غور کیجئے، کمال اختصار عرض کرتا ہوں۔ جب یزید
 ماہِ جبِ سنہ ۴۰ میں تختِ شام پر بیٹھا تو اُس نے حاکمِ مدینہ کو لکھا کہ حسین بن علی سے میری سبقت
 اور اگر وہ بیعت نہ کریں تو اُن کا سر کاٹ کر بھیج دو۔ تاریخ سے ثابت ہے جس سے کوئی انکار
 نہیں کر سکتا کہ بعد شہادت حضرت علی و حضرت امام حسین علیہم السلام امیر معاویہ تمام ملکِ شام
 و حجاز اور کوفہ و عراق و موصل کے بادشاہ ہو گئے تھے۔ تمام میں اُنکا عمل بیٹھ گیا تھا اور ہر جگہ
 اُن کا سکھ و خطبہ جاری تھا، اور بعد انتقالِ حضرت امام حسن علیہ السلام دس برس میں اُن کی
 سلطنت کمال تکمل ہو گئی تھی اس لئے جب یزید تخت پر بیٹھا تو ساری سلطنت اُس کے ہاتھ آئی
 سب ملک اُس کا، لشکر اُس کا، خزانہ اُس کا اور ہر صوبہ کے گورنر اس کے ایسی حالت میں کوئی
 شک نہیں کہ بیعت سے انکار کرنے کی حالت میں حضرت امام حسینؑ کی جان بلکہ سارے کنبہ کی
 جان معرضِ ہلاکت میں پڑ جاتی، اس لئے ظاہر ہو کر اسوقت مدینہ حضرت کے لئے محلِ خوف ہو گیا تھا۔

لیکن مکہ معظمہ وہ جگہ ہے جہاں حکمِ شریعت پشتہ کو ستانے کا حکم نہیں ہے اس خیال سے حضرت نے پناہ حاصل کرنے کے لئے اپنے اعتقاد کے موافق مدینہ سے مکہ کی طرف ہجرت فرمائی اس سفر میں فرزند ان وغریران و اہلبیت طاہرین علیہم السلام آپ کے ہمراہ تھے۔ ایسی صورت میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا کہ آپ محلِ ہلاکت سے محلِ امن کی طرف گئے، اس لئے یہ الزام کہ حضرت نے اپنے کو آپ ہلاکت میں لالشیعہ لیم امدہ ہی کو غلط کر دینا ہی بلکہ تفسیرِ عکس ہو جاتا ہے۔ آپ جب مکہ پہنچے تو حج کا زمانہ آگیا۔ آپ کو خبر ملی کہ فوجِ یزید شام سے حاجیوں کے بھیس میں آئی ہو اور اُس کا ارادہ ہے کہ حضرت سے حرمِ پاک میں گرفتار کرے یا قتل کرے یزید کو جس قدر پاسِ شریعت تھا ظاہر ہے اسلئے اس خبر کو باور نہ کرنے کی حضرت کو کوئی وجہ نہ تھی۔ آپ نے خیال فرمایا کہ اگر حرمِ تقدس میں میری ایسی بے حرمتی یا خونریزی ہوگی تو حرمِ اقدس کا بڑا استحقاف ہوگا اور (اسلام کی) بڑی توہین ہوگی، بہتر ہے کہ کو ذچلوں جہاں کے لوگ میرے لئے تمنائیں کر رہے ہیں۔ یہاں بھی اندک غور سے واضح ہوگا کہ اب مکہ معظمہ حضرت امام حسینؑ کے لئے محلِ خوف ہو گیا تھا اور کو ذ محلِ امن سمجھا گیا تھا۔ مگر چونکہ کو فیوں پر آپ کو پورا بھروسہ نہ تھا اس لئے آپ نے پہلے اپنے چچا زاد بھائی مسلم علیہ السلام کو اُس طرف بھیجا اور پھر خود روانہ ہوئے۔ اس وقت بھی کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت نے اپنے کو ہلاکت میں ڈالا بلکہ ہر ضعیف مزاج یہ کہے گا کہ اس موقع پر بھی آپ محلِ ہلاکت سے محلِ امن کی طرف گئے۔ بعد اسکے آپ رفتہ رفتہ فوارحِ عراق میں پہنچ گئے، اور حضرت مڑ علیہ السلام اور اُن کے لشکر سے (جنکو ابن زیاد کو رز کو ذ نے حضرت کی راہ روکنے کے لئے بھیجا تھا) ملاقات ہوئی۔

حضرت حرکی ملاقات پر آپ کو معلوم ہوا کہ سارا کو ذ آپ کے خلاف ہو گیا، اب آپ کا معین و مددگار وہاں کوئی نہیں۔ آپ کے بھائی مسلم علیہ السلام عالمِ غربت میں شہید ہوئے، اُنکے دو معصوم بچے نہایت بی رحمی سے قتل کئے گئے، شام سے فوجِ پرفج آرہی ہے اور ابن زیاد کا حکم ہے کہ حسینؑ ابنِ علیؑ جہاں ملیں اُن کو گرفتار کر و یا قتل کر دو۔ حضرت مڑ جب کا قلبِ پاک

نور ایمان سے ہر اہوا تھا، اُس وقت فوج مخالف میں تھے؛ مگر لوے اہلیت دل میں چکیاں لے رہی تھی اس لئے رائے دی کہ اب حضور کا کوفہ جانا مصلحت نہیں ہے اور مدینہ واپس جانا بیکار حکم نہیں پس بہتر ہے کہ حضور کسی دوسری جانب تشریف لیجائیں۔ حضرت نے اس رائے کو پسند کیا اور کوفہ سے عنانِ غزیمت موڑ کر شب کے وقت کوچ کیا کہ جدھر اللہ لے چلے اُدھر منزل بخدا چلے چلو۔

یہاں بھی غور کیجئے کہ حضرت نے حفاظتِ جان کی بڑی کوشش کی اور محلِ خوف (یعنی کوفہ) کی طرف رخ نہ کیا۔ اب گویا نئی راہ اختیار کی تھی۔ آخر قیسری محرم کو زمین کر بلا پر پہنچ گئے؛ لیکن ہزار افسوس کہ یہاں ابنِ زیاد کی فوج تعاقب میں آگئی اور آخر افواجِ کوفہ و شام کی ہمت کثرت ہوئی کہ حضرت بالکل محاصرہ میں آ گئے۔ اب آپ کو کسی طرف جانے کی اجازت یا مہلت نہ تھی۔

اب غور طلب یہ امر ہے کہ از ابتدا اتنا حضرت امامِ حسین علیہ السلام نے جان بچانے کی انتہائی کوشش کی یا نہیں اور جہاں ذرا بھی خوفِ ہلاکت یا خونریزی پھیل گیا وہاں سے کوچ کر کے محلِ امن کی طرف روانہ ہوئے یا نہیں؟ پس باوجود ایسی کوششِ بلیغ حفاظتِ جان کے آپ کو یہ الزام دینا کہ آپ نے اپنے کو ہلاکت میں ڈالا کس قدر لغو اور بے بنیاد ہے۔ حق یہ ہے کہ جنابِ امامِ حسین علیہ السلام کی شانِ عالی انتہائے قیاس سے اعلیٰ ہے، یعنی حضرت نے جو کام کیا اس کو انتہا کر کے دکھا دیا۔ جہاں حفاظتِ جان کی کوشش کی شرعاً ضرورت تھی وہاں ایسی کوشش فرمائی کہ جس سے بڑھ کر ممکن نہیں اور جہاں پروردگارِ عالم سے راضی برضا رہنے کا وقت آبلہ ہاں ایسے صبر و استقلال سے کارروائی کی کہ دنیا کی تاریخ میں اس کا جواب نہیں۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ جس صبر و استقلال سے حضرت سید الشہداء علیہ السلام نے عالمِ غیبت میں اپنے بھائیوں، بیٹوں، بیٹیوں، بھانجیوں کی شہادت گوارا فرما کر خود شہرتِ شہادت نوش فرمایا اُس کے مقابل میں کوئی واقعہ کسی مذہبِ ملت کا پیش نہیں کیا جاسکتا!

وہ کونسی بات تھی جس نے حضرت سید الشہداء علیہ السلام کو مصائب میں اس قدر مستقل رکھا اور وہ کونسی عزیز تر شہادت آپ کے سامنے جلوہ ظہور دکھاتی تھی جس کے مقابلہ میں آپ اپنے عزیزوں اور فرزندوں کے تلف ہونے کو دھیان میں نہ لائے ؟

میں کہ چکا ہوں کہ جب یزید تخت پر بیٹھا تو اُس نے امام حسین علیہ السلام سے بھبر بیعت لینے کا حکم صادر کیا۔ جن الفاظ میں اُسکی بیعت لی جاتی تھی اُن کو شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی رسالہ تکمیل الایمان میں یوں لکھتے ہیں کہ بیعت کرنے والوں سے اقرار لیا جاتا تھا کہ ”یزید چاہے ہم کو مثل غلاموں کے سر بازار فروخت کرے یا آزاد رکھے خدا کی عبادت کا حکم دے یا اُس سے روک دے۔“ اعمال و افعال اُس کے ایسے قبیح تھے کہ جس کی تصریح میں طبیعت کو نفرت اور کراہت ہوتی ہے مختصر یہ کہ شریعت میں جتنے امور حرام ہیں وہ اُس کے حکم سے حلال ہو گئے اور کل احکام خدا و رسول طاق نیاں پر رکھ دیئے گئے۔ زمانے محصنہ لواطہ شکر بخاری قمار بازی وغیرہ گناہان کبیرہ اُس کی شریعت سے عیب نثار دین میں داخل ہو گئے۔

اب ایسا فاسق فاجر شخص۔۔۔۔۔ امام زمان فرزند رسول سید شباب اہل الجنۃ سے بیعت کا خواستگار ہے۔ حضرت نے خیال فرمایا کہ ایسے مرتد کی بیعت کرنا منہیات کی رغبت دلانا بالکل اُسکی حمایت کرنا ہے اور اس میں اسلام کا خون ناحق ہے، یعنی جس اسلام کو آپ کے جذر گوارا نے سخت مصائب و درگیاں جمیل کر قائم فرمایا تھا اُس کو بیچ دین سے اٹھا بیچینکا اور قوم کو ایام جاہلیت سے بھی زیادہ جاہل شقی، مرتد بے دین بنا ناہی۔ غرض آپ نے بیعت سے صفا انکار کر دیا۔ لیکن چونکہ انکار میں خوف جان و عزت و آبرو سب کچھ تھا اس لئے حتی الامکان اپنی جان اور اپنے عزیزوں کو اعدائے دین کے شر سے بچاتے رہے اور ایک شہر سے دوسرے شہر لے پھرے۔ اس کے ساتھ ہی جب اتفاقاتِ زمانہ سے بالکل اعدائے دین کے محاصرے میں آ گئے اور امن و امان کی کوئی جگہ نہ ملی تو طرح کی صعوبت و شدت اور تکلیف ایزد گوارا کی لیکن بیعت یزید سے ہمیشہ کارہ و متنفر رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب عزیز و اقارب کٹ گئے نہایت تک

کہ خاندان بنی ہاشم

ایسا اُجڑا کمپسرنہ آباد ہوا

مگر بیعت یزید نہ کی پر نہ کی۔

میں جملہ مذاہب شیعہ، سنی، ہندو، نصاریٰ، یہود، بدھ، برہمن وغیرہ کے عقلا اور اہل الرائے سے مشورہ طلب ہوں۔ سب غور فرمائیں کہ وہ کونسی شے تھی جس کے مقابلہ میں حضرت سید الشہداء نے اپنے ایسے عزیزوں کے داغ گوارائے اور وہ کونسی بات تھی جس کے مقابلہ میں حضرت اپنے خاندان کے تباہ و برباد ہونے کو مطلق دھیان میں نہ لائے؛ یاد رکھنا چاہیے کہ ان کل مصائب کا ٹال دینا حضرت کے اختیار میں تھا، یعنی اگر آپ یزید کی بیعت کر لیتے تو پھر کچھ بچتا کیا کہ بلا کی کارروائی حضرت امام حسین علیہ السلام نے بطع خلافت فرمائی تھی؟

اس کے جواب میں معاذین تو بیشک یہی بول اٹھیں گے کہ حضرت بطع خلافت یہ کارروائی کی، لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر آپ کو طع خلافت ہوتی تو مدینہ سے سیدے کو فہلے جاتے۔ عرب کا نقشہ دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ مدینہ سے مکہ چوبیس دن کی راہ پر بجانب جنوب واقع ہے اور کو فہ مدینہ سے بھی بجانب شمال ہے، اس لئے مکہ سے جانب شمال مائل مشرق ڈیڑھ مہینے کی راہ پر واقع ہے۔ پس بجا لٹ طع خلافت آپکا چوبیس دن تک بجانب جنوب تشریف لیجنا، بعدہ جنوب سے شمال کی جانب پھر لوٹنا اور ایک مہینے کے قریب دہادے کا سفر کرنا بالکل بیکار معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ اگر لکھنؤ کے کسی شخص کو دارجلنگ میں کوئی محم پیش ہو تو وہ سیدہ مادارجلنگ چلا جائیگا، لکھنؤ سے حیدرآباد اور حیدرآباد سے دارجلنگ کیوں جانے لگا۔

صاف ظاہر ہے کہ حضرت ایک شہر سے دوسرے شہر کو صرف بنظر حفاظت جان اور بحرف بیعت یزید جاتے تھے اس کے سوا اور کوئی مقصد نہ تھا۔ اگر بطع خلافت جاتے تو جیسا کہ میں نے کہا ہے سیدے مدینہ سے کو فہ تشریف لیجاتے، مدینہ سے مکہ اور مکہ سے کو فہ۔۔۔ پھر کہا کہ جانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اور نہ چار مہینے تک مکہ میں قیام کی ضرورت تھی۔ حضرت

امام حسین علیہ السلام نے بتایں ہر شعبان مدینہ سے ہجرت فرمائی اور بتایں ۱۲ ذی الحجہ مکہ سے کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔

علامہ اس کے اس خیال فاسد کا وہیں پر خاتمہ ہو جاتا ہے جب حضرت خُرسے آپ کی ملاقات ہوئی اور معلوم ہوا کہ سارا کوفہ مخالفت پر کمر باندھے ہی، حضرت مسلم شہید ہو گئے، انکے دو معصوم بچے بیرجی سے قتل کئے گئے۔ اس کے بعد آپ کس بھروسے بطیع خلافت کرتے یا کوفہ کی طرف جاتے؟ چنانچہ کوفہ نہ گئے، بلکہ متوکل بجز اہماں خدا لے گیا وہاں گئے، آخر جلتے جاتے میدانِ کربلا میں پہنچ گئے اور فوجِ کثیر کے محاصرہ میں آ گئے۔ اس کے بعد تنہی کار روایاں حضور نے نہایت صبر و استقلال سے کیں اور سخت ترین مصائب برداشت کئے، اُن کو تو کوئی عاقل بطیع خلافت کرنے کا گمان تک نہیں کر سکتا، بلکہ اگر آپ کو طیع خلافت ہوتی تو آپ فوراً یزید کی بیعت کر لیتے، کیونکہ اس حالت میں یقین کے ساتھ اُمید کی جاسکتی تھی کہ یزید آپ کو فہ یا مدینہ کا حاکم مقرر کر دیتا۔ اس طرح آپ مطمئن ہو کر بہولت جمعیتِ فہم کرتے اور حوصلہ کے موافق یزید سے لڑ کر خلافت چھین لیتے۔ اب اس بات میں کوئی شک نہیں رہتا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے کربلا کی کارروائی ہرگز ہرگز بطیع خلافت نہیں کی تھی کیا امام حسین علیہ السلام ایک ضدی شخص تھے کہ آپ نے اپنی ضد سے اپنا اور دوسروں کا ضرر کیا؟ (نعوذ باللہ)

انہی غور سے یہ اعتراض بھی محض غلط اور تمام تر باطل ٹھہرتا ہے، کیونکہ ضدی، سڑی، سوداوی اُس بیوقوف شخص کو کہتے ہیں جو کسی کی بات کو نہ سنے اور نہ کسی کا کہنا مانے، نہ اپنی کے اور نہ اپنے دعوے کی دلیل پیش کرے، بلکہ محض اپنی ضد میں اپنا ضرر کرے اور دوسروں کو ضرر پہنچائے۔ امام حسین علیہ السلام ہرگز ایسے نہ تھے۔ آپ ہر شخص کی بات کو بغور سنتے اور ہر نیک و بد کو میزانِ عقل میں تولتے تھے۔ اگر خود دعویٰ کرتے تو اُس کی معقول دلیل دے کر دوسروں کو قائل کرتے تھے۔

اس کو خوب یاد رکھنا چاہیے فرزند ان اور عزیز ان اہلبیت آپ کے آپ کو نہایت ہی عزیز تھے۔ ہر شخص آپ کی آنکھوں کا تارا اور جگر کا ٹکڑا تھا۔ آپ نے اپنے بچوں کی حفاظت میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور جہاں ذرا جان کا خوف یا فساد کا احتمال ہوا وہاں عزیزوں کو ساتھ لے کر فوراً نکل گئے۔ آپ کا مدینہ سے نکل جانا کسی کے خلاف نہ تھا بلکہ شخص حضرت کے اعوان کی جان کی حفاظت اسی میں سمجھتا تھا، لیکن جب آپ نے مکہ سے کوفہ کا قصد کیا تو اکثر لوگ مزاحم ہوئے۔ حضرت عبداللہ ابن عمر (یعنی حضرت خلیفہ ثانی کے بیٹے) نے کہا کہ مصلحت یہ ہے کہ آپ یزید کی بیعت کر لیجئے اور پھر چہن سے مدینہ میں قیام کیجئے۔ جناب امام حسین علیہ السلام نے فرمایا بھائی! یہ کیا کہتے ہو۔ میں ہرگز یزید کی بیعت نہ کروں گا میں اپنے نانا رسول خدا کی سنت اور اپنے باپ حضرت علی مرتضیٰ کی خصلت پر رہوں گا۔ اس فرمائے سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ اگر میں یزید کی بیعت کر لوں تو پھر اسلام کا کہاں ٹھکانا رہیگا!! تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ جن اسلام کو میرے جد بزرگوار نے پیٹ پر پتھر باندھ کر پالا پرورش کیا ہو اُس کو میں اپنے ہاتھوں سے کھود دوں اور جن اسلام کو میرے پدر عالی مقدار نے اپنا سر بتلی پر رکھ کر پھیلایا ہے اُس کو میں خود اپنی کارروائی سے ڈبودوں؟ حضرت عبداللہ ابن عمر مرد معقول تھے مان گئے۔

اس کے بعد آپ کے سوتیلے بھائی محمد حنفیہ نے منع کیا اور کہا کوئی بے اعتبار ہوتے ہیں اُن کے قول و فعل کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ اُدھر آپ تشریف نہ لیجائے، اُس طرف جانے میں احتمال ضرر ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اگر کوفہ جانے میں احتمال ضرر ہو تو یہاں میں کس من کی جگہ میں ہوں۔ کوفہ کی تو ابھی تک کوئی بات خلاف معلوم نہیں ہوئی ہے، لیکن یہاں تو لوگ حاجیوں کے بھیس میں میرے قتل کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ مکہ معظمہ میدان جنگ اور خانہ کعبہ قتل سادات بنی فاطمہ بن جائے؟ اس سے تو ہزار درجہ بھی بہتر ہے کہ متوکل بچہ کوفہ کی طرف جاوے اور وہاں جو مشیت پروردگار ہو اُس پر راضی بخشا

رہوں۔ اس سے اتنا تو ہو گا کہ حرمتِ حرمِ محترم (خانہ کعبہ) برباد نہ ہو گی۔“ محمد حنفیہ اس کو مانکر کہنے لگے ”اچھا! آپ خود تشریف لے جائیے، لیکن حرمِ محترم کو ساتھ نہ لیجائیے۔“ چونکہ حضرت محمد حنفیہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے بھائی تھے اس لئے آپ کو مجبوری ہوئی کہ اپنے دردمند بھائی کو ایک سرخفی سے بھی آگاہ کر دیں، اس لئے حضرت نے فرمایا ”اس میں میں مجبور ہوں نہ تھا“ کا حکم ہی ہے۔“

یہ تو سرخفی تھا، لیکن میں کہتا ہوں کہ بابا پناہ بھی کوئی عاقل اس سے اختلاف نہ کرے گا کہ جب مدینہ اور مکہ دونوں آپ کے لئے محلِ خوف ہو گئے تھے تو حضرت کا مع اہلبیت طاہرین کے کو ذکیط تشریف لیجا نا خلافتِ مصلحت نہ تھا۔ اگر تنہا جاتے تو عیال و اطفال کو کس پر اور کس امید پر چھوڑ جاتے؟ جتنے فرزند و عزیزان حضور کے تھے، سب آپ کو بہت پیارے تھے۔ آپ ان کو اس محلِ خوف میں چھوڑ نہ سکتے تھے اور وہ لوگ حضور کو تنہا کیسے جانے نہ دیتے تھے۔ چنانچہ سب کے سب ساتھ ہوئے صرف حضرت عبداللہ (شوہر حضرت زینب)، اور حضرت محمد ابن حنفیہ بوجہ علالت کے ساتھ نہ سکے۔ ان کے سوا تو سارا کنبہ آپ کے ہمراہ تھا، اور آئندہ جو کچھ ہوا اس وقت تو ایک بہادر فوج بھی آپ کے ہمراہ تھی۔ ایسی حالت میں اس قافلہ کو چھوڑ کر اہلِ دعیال کو دو علیل بھائیوں کی حفاظت میں چھوڑنا اور خود مدینہ سے ہجرت فرمانا ہرگز مصلحتِ وقت کے موافق نہ تھا۔ یہ دیکھ کر محمد ابن حنفیہ بھی راضی ہو گئے۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جب حضرت حُر نے رد و بدل کے بعد شب کے وقت تخیلی کی ملاقات کی تو امام علیہ السلام سے کہا کہ ”یا حضرت! اس وقت میرا سارا لشکر سوتا ہے، آپ اسی وقت کوچ کر جائیے تاکہ اعدا کے شر سے نجات ملے۔“ آپ نے فوراً اس رائے کو قبول کر لیا اُسی وقت حضرت عباس کو کوچ کا حکم دیا اور خیمہ اکھڑ گیا۔ اگر حضرت امام حسین علیہ السلام ایک معمولی چٹیل طبیعت کے عرب ہوتے تو ہجر و سماعت اس خبر کے کہ کو فیوں نے عالمِ غربت میں آپ کے بھائی حضرت مسلم اور ان کے معصوم بچوں کو نہایت بیرحمی سے شہید کیا، بنظر انتقام کو ذکیط چلے جاتے

اور اپنے مظلوم بھائی اور بھائیوں کے خون کا بدلہ لیتے۔ لیکن چونکہ آپ نہایت متین اور سنجیدہ شخص تھے آپ نے ان واقعات پر صبر کیا اور کوفہ کی طرف کا قصد نہ کیا۔

اس وقت آپ کا اپنے غم و غصہ کو ضبط کرنا بیان سے زیادہ قابل خیال ہے حضرت مسلم آپ کے حقیقی چچا زاد بھائی تھے اور آپ کی سوتیلی بہن یعنی حضرت عباسؓ کی حقیقی بہن سے بیاہے ہوئے تھے۔ حضرت کی یہ بہن یعنی زوجہ حضرت مسلمؓ بھی اس سفر میں آپ کے ہمراہ تھیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام اپنی مصیبت زدہ بیوہ بہن کی آہ و زاری کو سن رہے ہیں۔ یہ بھی خوب سمجھ رہے ہیں کہ اس غریب بیوہ بہن کے شوہر کو ہم نے خود کوفہ کی طرف بھیجا تھا، تاہم نہایت ضبط اور تحمل سے کام لیتے ہیں۔

یہ واقعہ ایسا ہے کہ ہم سے سرد مزاج ضعیف القلب آدمی کی رگ ہاشمی کو بھی جوش میں لاسکتا ہے۔ ہم لوگ تو اپنے آپ میں نہ رہتے اور یہ کہ اٹھتے کہ ہرچہ بادا بادا ظالموں کو ضرور سزا اعمال دینی چاہیے۔ مگر فرزند رسولؐ کے ضبط و تحمل اور دوراندیشی کے قربان کہ اپنے غیظ و غضب کو ضبط کئے ہوئے ہیں اور کس فہم و فرست اور دوراندیشی سے غور فرماتے ہیں کہ اگر میں اس جماعت قبیل کے ساتھ ایک جابر بادشاہ کے ظالم گورنر کے دار الحکومت پر حملہ کروں تو نتیجہ اسکے سوا کچھ اور نہ ہوگا کہ ایک بھائی دو بھائی قتل ہو چکے بقیہ بھائی بھتیجے بھانجے سب کچھ نہیں لیکن نہ خدا خوش ہو نہ رسولؐ خوش ہوں۔ ایسی حالت میں مجھے اپنی نفسانیت اور اپنے غیظ و غضب کی تشفی کے لئے ہرگز ہرگز روا نہیں کہ ایسے ایسے نادر دنیا بے جواہر داعیہ کو اپنے ہاتھوں سے گنوا دوں، بلکہ مناسب وقت یہی ہے کہ اس وقت کوچ کر جاؤں تاکہ میری عزیزوں کی جان بچے۔ اگر آپ غور فرمائیں گے تو اسی ایک واقعہ سے یہ دونوں اعتراض یعنی (۱) یہ کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے کو تنگہ میں ڈالا اور (۲) یہ کہ حضرت ایک مذہبی شخص تھے۔۔۔ ایک دم پاش پاش اور ہوا ہو جاتے ہیں۔ کون شخص بحالت صحت ذات و ثبات و عقل ایسے تحمل بردبار، مضابط اور کاظم الغیظ شخص کو ضدی اور اپنے کو آپ ہلاکت میں ڈالنے والا کہہ سکتا ہے ؟ اور

اس کے بعد تو کوئی مطلوب الحواس بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کربلا میں نہایت صبر و استقلال سے حضرت امام حسین علیہ السلام نے جو کارروائیاں کی تھیں وہ بطبع خلافت کی تھیں۔

آخر آخر وقت تک معرکہ کربلا میں آپ نے عمر ابن سعد سے بار بار کہا اور متواتر خطبات ارشاد فرمائے کہ ”اگر تم لوگ ہماری جان (اور ہمارے عزیزوں کی جان) کی اماں دو تو ہم تمہارا ملک چھوڑنے کے لئے تیار ہیں ہم وعدہ کرتے ہیں کہ نہ ہم مکہ جائیں گے نہ مدینہ اور نہ کوفہ ہم مین یا دیار ہند کی طرف چلے جائیں گے تاکہ تم کو میری طرف سے کسی قسم کے ضرر کا گمان نہ ہو۔ اب آپ فرمائیے کہ اس سے زیادہ جناب امام حسین علیہ السلام اور کیا کہتے یا کیا کرتے یا کوئی دوسرا عاقل و فرزانہ شخص کیا کرتا؟ پس ایسے سخن شنو، مصلحت میں، صلح جو، امان طلب شخص کو ضدی اور ہٹ دھرم دہی شخص کسے گا جو خود سڑی سودائی ہوگا۔

کیا حضرت امام حسین علیہ السلام نے کربلا کا معرکہ عظیم صرف اعزازِ خاندانی یا بقائے اسلام کے خیال سے اختیار فرمایا تھا؟

اگر حضرت کو طبع خلافت نہ تھی یا ضدی شخص نہ تھے تو یہ سوال پیدا ہوتا کہ کونسی بات آپ کے دل میں ایسی تحریک پیدا کرتی تھی جس کے مقابلہ میں آپ نے بیعت یزید کا ننگ گوارا نہ کیا؟ اس کے جواب میں بعض اہل الرائے کہہ سکتے ہیں کہ حضرت نے عزتِ خاندانی کے خیال سے ایسا نہ کیا، لیکن جہان تک میں دیکھتا ہوں ساتویں محرم کو یہ بات بھی ختم ہو جاتی ہے۔ ساتویں محرم وہ تاریخ ہے کہ تیس ہزار سے زیادہ لشکر جرار آپ کے مقابلہ کو پہنچ گیا۔ آپ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، گھاٹ ٹوک گئے، پانی خیموں میں آنا بند ہو گیا، لعش کی ہر طرف پکڑ ہونے لگی۔ چاروں طرف نیزوں کی بجائیں چمک رہی ہیں، تابشِ آفتاب سے خیمے دھک رہے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر آپ صلح کر لیتے تو سابق کی خاندانی نظیروں کے خلاف نہوتا، کیونکہ اس سے بہت کم حالت تھی جب خود حضرت سرورِ کائناتؐ فی مقامِ حدیبیہ کفارِ قریش سے صلح فرمائی تھی، اس سے کم حالت تھی جب حضرت کے والد بزرگوار

حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام جنگ صفین میں امیر معاویہ سے صلح پر مجبور کئے گئے تھے، اس سے بہت کم حالت تھی جب آپ کے برادر عالمقدار حضرت امام حسن علیہ السلام امیر معاویہ سے صلح پر مجبور ہوئے تھے۔ اس لئے اگر آپ بھی صلح کر لیتے تو اعزازِ خاندانی کے خلاف نہ تھا۔ پس یہ بات کہ حضرت نے مجبوراً اعزازِ خاندانی کے خیال سے اتنا بڑا معرکہ گوارا فرمایا اور اس صبر و استقلال سے اپنا گھرنہ دیا دلنشین نہیں ہوتی۔ ایسی حالت میں دل کو تشویش ہوتی ہے کہ واقعی کیا بات حضرت امام حسین علیہ السلام کے خاطر مبارک میں تحریک کرتی تھی کہ آپ نے سب صعوبتیں گوارا فرمائیں لیکن یزید کی بیعت نہ کی؟ اس کے جواب میں اہل اہل ائے کہہ سکتے ہیں کہ قیام و استحکامِ اسلام کے لئے حضرت نے یہ سب صعوبتیں گوارا فرمائیں! مجھے اس ائے کے صائب ہونے میں مطلق کلام نہیں۔ لیکن میں جہاں تک خیال کرتا ہوں نویں محرم کی شام سے جو کارروائی حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمائی اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بقائے اسلام کے علاوہ حضرت نے اپنی ذاتی ترقی اعلیٰ ترین درجہ پر فائز ہونے کا اہتمام آغاز فرمایا تھا۔ یہ اس طرح پر کہ حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے :-

وَلَسَبَلُوا نَفْسَهُمْ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقَصُوا مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ
وَالْعُرْثِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ
وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ ۚ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ
هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۝

خلاصہ یہ ہے کہ ہم تمہارا ان پانچ چیزوں میں سے کسی ایک چیز یعنی خوف، بھوک، نقصانِ مال، نقصانِ جان، یا نقصانِ ثمرات یعنی اولاد میں امتحان کرینگے۔

قرآن بہت فرزندِ رسولؐ کے اپنے فرمایا: خدا یا اے الہیک۔ تیرا یہ بندہ احقر یا بچوں امور میں بلکہ اُن سے زیادہ امور میں بیک وقت امتحان دینے کو حاضر ہے۔ حکم الہی آیا بسم اللہ! میدان میں آئیے۔ ہمارے فرشتے آپ کے صبر و استقلال کا موازنہ کریں گے۔

حق تعالیٰ نے اُسی آیت کریمہ میں فرمایا ہے کہ جو میرے خاص بندے صابر ہیں وہ نصیب پڑنے کے وقت انا للہ وانا الیہ راجعون کہتے ہیں؛ یعنی کہتے ہیں کہ خدا یا اہم تیرے لئے ہیں اور تیری طرف بازگشت کرنے والے ہیں۔ اس امام جلیل خلاصہ خاندان ابراہیم و اسمعیل نے خیال کیا کہ فقط زبانی انا للہ وانا الیہ راجعون کہا تو کیا، اگر اپنے افعال سے دکھا دوں کہ واقعی ہم لوگ تیرے لئے خدا کے لئے ہیں اور تیری طرف بازگشت کرنے والے ہیں تو البتہ سند ہے!۔

نویں محرم کو جیسا بن سعد نے لڑائی چاہی تو حضرت نے اس اہتمام کے لئے ایک شبکی مہلت لی جب یہ مہلت منظور ہوئی تو شام کے وقت آپ نے اپنے تمام انصار کو ایک جگہ جمع کر کے فرمایا کہ یہ فجر کو فوج و شام ہمارے سر کی طلب گار ہے تم سے اس کو کوئی بچاؤ نہیں اور جس حالت میں میں پہنچ گیا ہوں اب اس سے میری جانبری محال ہے۔ پس تم میرے لئے کیوں اپنی جانیں تلف کرتے ہو۔ میں تم کو خوشی اجازت دیتا ہوں کہ تمہارا جد حرجی جاہے چلے جاؤ، بلکہ میں اپنی بیعت بھی تم سے اٹھائے لیتا ہوں۔

یہ امر کچھ کم غور طلب نہیں کہ اگر مقصد اقصیٰ آپ کا صرف بقائے اسلام ہوتا تو اپنی جماعت کو کم نہ کرتے؛ کیونکہ آپ کی فوج جس قدر زیادہ ہوتی اُسی قدر قوت ظاہری بھی زیادہ ہوتی۔ چنانچہ یہ عام قاعدہ اتنا چلا آتا ہے کہ حالت خوف میں سردار لشکر جہاں تک ممکن ہوتا ہے اپنی جماعت کو سمیٹے رہتا ہے؛ بلکہ بھاگنے والوں کو گولی مارنے کا حکم دیتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اس کارروائی سے حضرت امام حسین علیہ السلام کا مقصد اقصیٰ یہ تھا کہ اے حسین! امتحان تو شروع ہو گیا، بھوک پیاس کی شدت شروع ہو گئی، اب انا للہ وانا الیہ راجعون کی عملی تیاری کرو۔ اس لئے پہلے آپ نے ان لوگوں کو انتخاب کیا جو زمرد اللہ میں داخل ہونے کا شرف پانے والے تھے۔ بہتر بزرگوار ایسے نیکے جنہوں نے منجھڑ شروع اس مقدس فہرست میں اپنے نام نامی لکھوائے، لیکن جبکی قیمت میں یہ شرف نہ تھا وہ لوگ

شب عاشورہ ادھر اُدھر چل نکلے۔

الغرض شب بھر حضور اقدس نے عبادتِ خدا میں بسر کی، نمازیانِ باصفاء، رضایہ و دگا علم کے حصول کے لئے بچیں رہے، اہلبیت طاہرین نے اپنے اپنے فرزندوں کو سنوارا اور تلقین کی کہ دیکھو کل تمہارے آقا پر حملہ ہوگا ایسا نہ کہ پسپا ہو جاوے یا شمشیر مخالفین سے ڈر جاوے یا بھوک پیاس کی شدت سے تڑپنے لگو۔ اُن معصوموں نے یقین دلایا کہ اگر ہم اپنے آقا پر اپنی جانیں فدا نہ کریں تو آپ دودھ نہ بخشیں!

شب عاشورکٹ گئی اور صبح شہادت آئی! اب غازیانِ دین، سفرِ آخرت کی سُرُجِ اُجالی اللہ تباری کرنے لگے۔ ادھر آقا سے اجازت ملی فوراً گھوڑے اڑاتے ہوئے شادان و فرحان میدانِ جنگ میں گئے اور کھالِ بہادری اور جانِ شاری دکھا کر رحمتِ خدا سے جالے۔ آخر عزیزوں کی نوبت پہنچی اور

وہ بچھڑنے لگے گودی میں جنھیں پالا تھا!

دوبقیہ پر انِ مسلم بھی شہید ہوئے، حضرت امام حسین علیہ السلام راضی برضار ہر پیاری بہنِ زینبؑ اپنے بیٹوں کو رخصت دلوانے کے لئے حاضر ہوتی ہیں۔ قلب پر سخت چوٹ پڑتی ہے، بہن کی کمانی ہاتھ سے کھوئی نہیں جاتی مگر نہایت استقلال سے پیادے بھانجے میدان میں بھیج دیئے جاتے ہیں اور جب انکی لاشیں آتی ہیں تو صدمہ تو اُنہما کا ہوتا ہے مگر جادہ صبر و استقلال سے قدم نہیں ہٹتا۔

اب اس مصیبت کا سامنا ہو کہ تازہ داماد رخصت پر مصر ہے، برادرِ مرحوم کی نشانی ہاتھوں سے جا رہی ہے، بیٹی کے رند سالہ کا سامان ہو رہا ہے مگر پھر رخصت سے انکار نہیں کیا جاتا۔ خود اپنے ناشاد نامراد داماد کو گھوڑے پر چڑھاتے ہیں اور جب اس کی لاش آتی ہے تو باوجود خیمہٗ مجبارک میں کمر لم پڑنے کے حضرت کا استقلال نہیں جاتا، اور بالکل راضی برضار ہوتے ہیں۔ اب وہ وقت آیا کہ برابر کا بھائی جو اشجع الناس تھا اور جس سے ہر شخص کو بڑی تقویت تھی

خصت طلب ہو آپ کی آنکھوں میں دنیا سیاہ معلوم ہوتی ہے، مایوسی چاروں طرف گر گھیر لیتی
ہی، لیکن اپنے قوتِ بازو کو اجازتِ جنگ دیتے ہیں اور جب وہ جاں نثار بھائی آواز دیتا ہے
یا اخی یا مولائی! ادر کھنٹی تو آپ کو صدمہ تو ایسا ہوتا ہے کہ کمر خمیدہ ہو جاتی ہے، طاقتِ قیام
جاتی رہتی ہے اور عالمِ یاس میں پھین ہو کر فرماتے ہیں اَلَا اَنْ اَنْفَلَسْتُ خُضْرَیْ وَ قَلْتُ
حَیْلَیْ، یعنی اب میری کمر شکستہ ہو گئی اور ساری آس ٹوٹ گئی۔ لیکن اسپر ہی جب اُس وقت
بازو بھاؤ بھائی کی لاشِ مبارک پر پہنچتے ہیں تو کھالِ صبر و استقلال کے ساتھ خالی مشک و حکم کو بیکہ
خیمہ مبارک میں واپس آتے ہیں اور آزادی میں ویسے ہی مستقل ہوتے ہیں۔

اس کے بعد اس فنِ خاندانِ خلیل و اخیل کے سامنے یہ مرحلہ پیش آیا کہ اٹھارہ برس کا
نوجوان بیٹا، ہشکل رسولی جس کی زیارت سے آنکھیں نمند ہوتی تھیں اور سوختہ صلی بہ
علیہ وآلہ وسلم یاد آتے تھے رخصت طلب ہو اور اُسی میدان میں جانا چاہتا ہے جہاں ابھی تک
حضرت عباس غازی کی لاش پڑی ہوئی ہے اُس وقت حضرت امام حسینؑ کے دل پر چوٹ
تو ایسی پڑتی ہے کہ بے قرار ہو کر گر پڑتے ہیں لیکن ایک ایسی چیز (القاء رحمۃ پروردگار عالم) اپنا
جلوہ طور دکھاتی ہے کہ اُس کے پر تو سے آپ حضرت علی اکبرؑ کی مرگِ شباب کو دہیان میں
نہیں لاتے، حالانکہ صدمہ قلبی آپ کو ویسا ہی ہو رہا ہے۔ منقول ہے کہ قبل شہادت حضرت
علی اکبرؑ کی ریش مبارک کے کل بال سیاہ تھے مگر بعد شہادت فرزندِ زیادہ تر بال سفید ہو گئے۔
اس پر بھی آپ کے صبر و استقلال میں فرق نہ آیا اور اپنے تختِ جگر کے سینہ مبارک سے خود ہرچہ کا
پھل نکالا اور راضی برضا رہے۔ امتحان دینا اسے کہتے ہیں !!!

اتنے میں فضا نے آواز دی ”یا حضرت علیؑ صغریا یس کے مارے دم توڑ رہا ہے، خبر لیجئے“
آپ اُس بچہ کو میدان میں لائے اور فرمایا کہ ”میرے بچہ، ناتہ صلح سے کم نہیں ہے، ہے کوئی ایسا
جو اس معصوم بچے کے خلقِ خشک تک تھوڑا پانی پہنچائے؟“ اس کے جواب میں ہرچہ حرمِ حرمت
اُس بچہ کو آپ تیرے سیراب کیا اور وہ بچہ تڑپ تڑپ کر آپ کی گود میں شہید ہوا۔

اب حضرت یکر و تنہارہ گئے، اور خود لقاے پروردگار عالم اور جو رحمت سے ملنے کے لئے تیار ہوئے عصر کا وقت آگیا ہی دھنوں سے چور چور ہو کر گھوڑے پر ڈمگاتے ہیں جسم پر آئیں سو سے زیادہ زخم پڑ چکے ہیں تیر بدن میں پیوست ہیں لیکن استقلال وہی ہی۔ بلکہ غالباً اس خیال سے کہ ”اے حسین! اپنے جیب کے پاس جاتے ہو تو تمام امتحان پورے کر لو۔ ذرا چلتے چلتے اپنی پیاری بہنوں اور بیٹیوں کو تو دیکھ لو، ایسا نہ کہ کہا جائے کہ اگر انکی مایوش صورتیں تمہارے سامنے ہوتیں تو تمہارے دل پر ایسا اثر پڑتا کہ تمہارے استقلال میں فرق آجاتا۔“ آپ فوراً دُخمیہ پر تشریف لائے۔ اُس وقت حضور کے جسم مبارک میں اس قدر تیر پیوست تھے کہ اہلبیت علیہم السلام کو شناخت میں تامل ہوا۔ جب سبھوں نے پہچانا تو سب بیبیاں اکر قدم پاک سے لپٹ گئیں اور آپ کی دُختر چار سالہ حضرت سکینہؓ سینے سے چمٹ گئی حضرت نے اپنے فرزند علیل کو جگایا اور بعد و دلیعت اسرارِ امانت و احکام شریعتِ نخت طلب ہوئے خیمہ مبارک میں کھڑم پڑ گیا۔ اُس وقت کا عالم بیان سے زیادہ قابل خیال ہے آپ نے پہلے حضرت سکینہؓ کو گودی سے اُتار کر حضرت زینبؓ کے حوالہ کیا اور کہا ”بہن! میری یہ بیٹی بہت ناز پروردہ ہر اسکی برابر خبر لیتی رہنا، بعدہ بہت منت کر کے سب بیٹیوں سے رخصت ہوئے اور خیمہ مبارک سے باہر اکر بزبانِ حال یہ فرمایا

یارب! ہر یہ سادات کا گھر تیرے حوالے رائڈ میں ہیں کسی خستہ جگر تیرے حوالے
بیکس کا ہے بیمار پسر تیرے حوالے سب ہیں ترے دریا کے گھر تیرے حوالے
عالم ہر کہ غربت میں گرفتار بلا ہوں

میں تیری حمایت میں انھیں چھوڑ چلا ہوں

اب میں سبقتِ اقلیم کے اہل الرائے سے سوال کرتا ہوں خوب غور کر کے فرمائیں کہ اس وقت جنابِ ام حنینؓ کے دل میں کونسی بات تحریک کرتی تھی کہ اپنے ناموس کو یوں بے مہاسے چھوڑ کر میدان کی طرف جاتے ہیں اور جس وقت حضور اقدس نے حضرت سکینہؓ کو اپنے آغوش مبارک

سے اُتارا اُس وقت کونسی عزیز تر شے آپ کی آنکھوں کے سامنے تھی جس نے حضرت سکینہ کی صورت پر پردہ دے دیا؟ فقیر کے نزدیک اس کے سوا اور کوئی بات معلوم نہیں ہوتی کہ اب حضور کو درجہ وصال ملنے والا ہو اور تقارحمت اپنا جلوہ ظہور دکھا رہی ہو۔ اسی وجہ سے اہل حرم کی بکیسی اور بیچاریگی رجوع قلب میں فرق نہیں آنے دیتی۔

اس درجہ وصال پر فائز ہونے کے لئے یہ زینہ بڑا دشوار گزار تھا لیکن قربانِ مہبتِ فرزندِ رسولؐ کہ آپ اس زینہ سے بھی باسانی بڑھ گئے اور اہل بیتِ طاہرینؑ کو سپردِ بختِ خدا کر کے میدان میں تشریف لائے۔ اب تو صرف آخر کار ایک زینہ باقی ہو، یعنی حضرت گھوڑے سے گرے، شمر خجہ کف اگر سینہ مبارک پر سوار ہوا اور حضرت اس وقت اُمتِ عاصی کے حقیقی دعا کرتے ہوئے عرشِ عظیم پر پہنچ گئے۔ اور درجہ وصال سے مشرف ہو کر رحمتِ ایزدی سے مل گئے اور اپنے بے بہا صبر و استقلال سے انا للہ وانا الیہ راجعون کے حقیقی معنی پر فائز ہو کر زندہ جاوید ہو گئے!

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ

ایسے ہی بزرگوں کی شانِ پاک میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَلَا تَقُولُوا الْمَيِّتُ قَدْ قُتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءُ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ ۝

یعنی

جو لوگ راہِ خدا میں قتل ہوئے ہیں اُن کو مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم کو اُن کے دیکھنے کا شعور نہیں۔

اگر اس آیتِ کریمہ کے مدارج کے قابلِ شدائے کر بلا نہ سمجھے جائیں تو دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے کوئی دوسرا شخص اس کا سختی نہ ملے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جناب سید الشہداء علیہ السلام کی ذاتِ بابرکات ایسی ہے کہ قطع نظر اس امر کے کہ آپ رسولِ برحق کے نواسے ہیں اور قطع نظر اس کے کہ آپ امام ابنِ امام

ہیں خود آپ کی سیرت اور آپ کے اعمال ایسے ہیں کہ ہر شخص آپ کو انسان کا مل سمجھے گا
 کیونکہ جو شخص واقعات کر بلا کو بنظر غور و تعمق دیکھے گا وہ عالم اس سے کہ اُس کا اپنا کچھ ہی مذہب
 کیوں نہ ہو بلاریب و تشک کے گا کہ حسین ابن علی علیہم السلام نے ایسے ایسے سخت اور جاں گزا
 مصائب صرف اس وجہ سے اختیار کئے تھے کہ اُن کو اس کا کامل یقین ہو گیا تھا کہ جو بات میں
 دل میں ٹھان لی ہو اسی میں پروردگار عالم کی خوشی ہے، یعنی اگر میں یزید کی بیعت کروں
 تو اسلام بالکل تباہ و برباد ہو جائے گا اور اب وجہ کا سارا ریاض می میں مل جائے گا۔
 لیکن اگر میں یزید کی بیعت نہ کروں تو اسلام قائم رہے گا اور خداوند عالم مجھ سے رضی اور خوشنود
 ہوگا، اور خوشنودی و رضائے پروردگار عالم کے لئے سب مصیبتوں اور آفتوں کو صبر و رضا کے
 ساتھ برداشت کرنا محال عبادیت ہے، اس لئے اس فی سبیل اللہ مہم میں کسی چیز کو حتیٰ کہ اپنے
 فرزندوں اور جگر گوشوں کو بھی جو میرے سرمایہ زندگی ہیں عزیز کرنا چاہیے۔ کوئی شک نہیں
 کہ حضرت نے تمام مصائب ہر قسم کی تباہی اور خانہ بربادی صرف رضائے الہی کے لئے گوارا
 فرمایا۔ پس جو شخص مجرد حق تعالیٰ جل شانہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے اپنے بیٹے بھتیجے
 بھانجے بھائی کی شہادت قبول فرما کر خود عالم غربت میں بھوکا پیاسا شہید ہو اُس کے مقبول
 بارگاہ احدیت ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے ؟

ہاں ! اگر کوئی مخالف کہہ سکتا ہے تو یہ کہہ سکتا ہے کہ حضرت اپنے خیال ہی میں غلطی پر
 تھے۔ لیکن اس کی نسبت بھی غالباً کوئی شخص انکار نہ کرے گا کہ یزید کے اعمال و افعال بالکل اسلام
 بلکہ تہذیب و اخلاق کے ڈبوں والے تھے۔ اس لئے اُس کی بیعت کرنے سے اسلام خاک میں
 مل جاتا اور انسان بہائم ہو جاتے ! تب یہ خیال ہرگز غلط نہیں ہو سکتا کہ حق تعالیٰ محض
 دین اسلام اور محض تہذیب و اخلاق کی حمایت کو ہرگز پسند نہیں کرتا حضرت سید الشہداء کا یہ
 علم و یقین کہ خداوند عالم کی خوشی اسی میں ہے کہ میں یزید کی بیعت نہ کروں اور اسلام کو بے اثر
 اور بے عیب رکھوں غلط تھا۔ کوئی شک نہیں کہ حضرت امام حسین نے رضائے پروردگار عالم

کے لئے وہ کام کیا جو آج تک کسی بشر سے نہ ہوا، پس آپ بلاشبہ و شک دنیا کے ایک بڑے
فرد فرید اور سید الشہداء ہیں، اور ہر قوم و ملت میں قابل تعظیم۔

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ

چنانچہ خدا کے فضل سے واقعہ بھی ایسا ہے کہ ہر مذہب و ملت والے جو حضرت کے حالات
صبر و استقلال سے واقف ہیں آپ کی بڑی عظمت کرتے ہیں۔ گویا آپ زندوں کی طرح فرمانروا
ہیں۔ اور ہندوستان میں تو ہمارے ہندو بھائی حضرت کی پوری عزاداری کرتے ہیں۔ اگر کسی
کو شک ہو تو اس وقت حضور ہمارا جہاد گرو الیہ سے دریافت کرے کہ حضور کی ریاست میں
سالانہ موازنہ کے اندر محمد شریف کا خرچ کس قدر کیا جاتا ہے۔ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں
کسی مذہب کے پیشوا کے لئے دوسرے مذہب والے اگر بہت کرتے ہیں تو اتفاقاً کسی کی خاطر
سے کچھ بطور عطیہ کے دیدیتے ہیں مگر ہمارے آقا حضرت سید الشہداء علیہ السلام کے لئے تو لاکھوں
ہندو محض صدق دل اور سچے اعتقاد سے بلا کسی کی ترغیب و تحریص کے لاکھوں روپیہ سال
خرچ کرتے ہیں اور اس میں ترقی کر رہے ہیں۔

ان کے علاوہ تمام اقاہم کے مؤرخین نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے صبر و استقلال کی
بڑی تعریف کی ہے۔ لیکن ہزار افسوس کہ جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں وہی ان کی
تحقیق تو نہیں کرتے ہیں اور آپ کی شان مبارک میں کریمہ الفاظ ”اپنی منزلت اعمال کو پہنچے“
استعمال کرتے ہیں۔ شرم! شرم!!

ایک بات اور قابل لحاظ ہے کہ حضرت سید الشہداء علیہ السلام کا سارا خاندان صبر و استقلال
میں کیتائے روزگار ہے۔ اہلبیت طاہرین کا حال تو آپ نے سنا کہ شب عاشورہ اپنے اپنے
لے حضور ہمارا جہاد گرو الیہ کی طرح حضور ہمارا جہاد گرو الیہ سے بچھی رکھتے ہیں اور
حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے موازنہ میں ایک معقول رقم مقرر فرمانے کے ایک غزا خانہ بھی تعمیر فرمایا ہے
جو اندر کی قابل دید عمارتوں میں ہے۔ سید منظر علی

فرزندوں کو تلقین کرتی تھیں کہ آج جانبازی کا دن ہے، ہرگز ہرگز قدم پیچھے نہ ہٹانا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بعد شہادت بھی اہمیت سے اسی صبر و استقلال سے تمام مصیبتوں کو برداشت کیا اور خاندانی اعزاز و توقیر کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اس باب میں سب چھوٹے بڑے یکساں متحمل و مستقل ہے۔

اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ

آخر میں آپ حضرات سے بحال ادب و تعظیم چند سوال کرتا ہوں۔ براہ کرم غور فرمائے اور دیکھ لیجئے کہ آپ کا علم و یقین کیا جواب دیتا ہو۔

(۱) جس بزرگ کو میں نے بحیثیت ایک فرد فرد کے مجرد واقعات سے ایسا عالی وقار ثابت کیا ہے اس کے ساتھ ہم لوگوں کو کس قدر ہمدردی کرنی چاہیے ؟

(۲) ہماری اور جمہور مسلمانوں کی ہمدردی اس بزرگ کے ساتھ کس قدر ہونی چاہیے جب یہ معلوم ہو کہ یہ عالی وقار ہمارے رسول اکرم صلعم کا پیارا فرزند ہے جس کو آپ کا ندھی پڑ چڑھاتے تھے اور اپنا عمر زندگی خیال فرماتے تھے ؟

(۳) ہمیں اس بزرگ کے ساتھ کس قدر ہمدردی کرنی چاہیے اور اس کے فضائل و مناقب و مراتب کی یادگار قیام کرنے میں کس قدر اہتمام کرنا چاہیے جب یہ معلوم ہو کہ یہ بزرگ جس نے ایسے مدایح اعلیٰ حاصل فرمائے ہمارے جد امجد تھے ؟ العدا کبر !!!

(۴) جمہور مسلمانان کو اس بزرگ کے ساتھ کیسی ہمدردی کرنی چاہیے، اور کس قدر اور کس طریقے سے اپنی ہمدردی اور شکر گزاری کا اظہار کرنا چاہیے اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس بزرگ عالی وقار والا ہم نے یہ سب مصائب اس لئے برداشت کیے تھے کہ بروز قیامت اس کو ایسا درجہ حاصل ہو کہ درگاہ شہنشاہ قہار و جبار کے سامنے اس کو ہم سے گنہگاروں کی شفاعت کا موقع ملے اور ہماری جان بچائے ؟ ورنہ بذات خود اس کا بہشت میں جانا تو روز ازل سے معین تھا۔

حسین اور خصال سازی

(نوشتہ جناب مولوی سید ریاض علی صاحب ریاض موفی شہید عظم)

کسی کے نزدیک اگر عنوان کے الفاظ مبہم ہوں تو مجھے اُن کے مبہم تسلیم کرنے میں عذر نہیں ہے۔ لیکن کہنا یہ ہے کہ میں نے اُن کی شرح کا ارادہ کیا ہے اور بالارادہ ایسے الفاظ منتخب کئے ہیں جنہیں کافی لچک ہو، اور وہ اس خیال پر حاوی ہونے میں میری مدد کریں جب تکے ظاہر کر سکیں خواہش ہے۔

۱۔ عنوان بالا سے خیال ہو سکتا ہے کہ وہ کون سے اسباب تھے جو حسین کی خصال سازی میں معین ہوئے ؟ اور

۲۔ وہ کون سے اسباب حسین کی ذات نے پیدا کئے جو بنی نوع انسان کی خصال سازی میں مدد دے سکتے ہیں ؟

پہلی بات ایک تاریخی معاملہ ہے، یعنی کچھ ایسے اسباب اور کچھ ایسے نفوس تھے جنہوں نے حسین کی خصال سازی میں مدد دی۔ یہ ایک ایسا بیض مضمون ہے جس کے چند صفحوں میں گنجائش ممکن نہیں۔ امر دوم کہ آیا حسین کی ذات نے کچھ ایسے اسباب پیدا کئے یا نہیں جو خصال سازی میں معین ہوں ؟ یہ ایک ایسی بات ہے جس نے اپنی فطری حیثیت سے خصال سازی کو نشان چھوڑے، اور حسین کی ذات اب ایک ایسی ذات ہو کہ اگر دنیا میں خصال سازی کے لئے کچھ ذرائع ہیں جو کام میں نہیں لائے جاسکے تو جب حسین کے اُس شخص کی شرح کی جائے گی جو انہوں نے قائم کیا، تو نہ صرف کوئی فرد، مجموعہ افراد اور گروہ دیکھے گا کہ اس میں خصال سازی کی بہترین قابلیت ہے، بلکہ اُس سے بلند تر ایک بین الاقوامی پسند کی خبر پائے گا، اور

اس طرح حسینؑ کا شخص بلا امتیاز مقام، وقت، زمان اور رنگ کے اہل عالم کا ایک عام ورثہ ہوگا۔ قبل اس کے کہ میں اُن دونوں عیثیتوں پر نظر کروں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند الفاظ خصال کی شرح میں لکھے جائیں جس سے یہ دشواری نہو کہ آخر خصلت کہتے کسے ہیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ خصلت کی تعریف کے لئے مناسب الفاظ نہیں پاتا۔ سقراط کی مدد بھی اس ناقابل بیان حالت کے لئے کوئی تراشی اور خشک کی ہوئی تعریف مبیانہ کر سکیگی۔ پھر بھی کسی کے سامنے یہ لفظ استعمال کر دو اور تم دیکھو گے کہ اُس کا تمام قیافہ سمجھائے دیتا ہے کہ وہ سمجھ گیا۔ میں سوچتا ہوں کہ اُسے اپنی شرح کے لئے ویسی ہی دشواری ہی جیسی انسانی روح کو طبیب، فلسفی، سائنس دان، ہر ایک کے پاس اپنے علم و فن کے ہر درجہ ترقی کے موافق ایک شرح ہے، پھر بھی اُسے طے کرنا پڑتا ہے کہ ہماری تعریف کی چول کہیں سے ڈھیلی ہے۔ لیکن کسی انسان سے پوچھو کہ تم روح کو سمجھتے ہو یا نہیں، اور وہ حیرت کرے گا کہ اس ظاہر حلت کے لئے بے سود اقرار کرنے کے معنی کیا ہیں۔ پس روح اور خصلت کے سمجھنے کی دشواری ہے جس کے لحاظ سے میرا یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ان دونوں چیزوں میں ایک قوی مماثلت ہے۔ اپنے خاصہ اپنی ساخت، اپنی قابلیت میں نہیں اپنی شرح اور اپنی تفہیم میں۔

ہم نہیں جانتے کہ روح مفرد ہے یا مرکب، لیکن خصلت کے متعلق یہ قطعی اور ختمی تصفیہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ کسی مفرد شے کا نتیجہ یا نام نہیں، بلکہ ایک مجموعہ کا نام ہے۔ مجموعہ جس کے مفرد عناصر کے نام ہیں انسان کی صحیح الحواسی (مادی اور روحانی)، اُس کا عمل، مقام، آب و ہوا، دیگر طبائع کا اسکی طبیعت پر عمل، قوت تصفیہ، جماعت انسانی کی روش اور اُس میں اخلاقی جس کا پیدا ہونا، قبولیت، جگہ کرنا اور عادت ہو جانا، اُس کا قبیلہ اور بشرے پر عمل، کسی مفروضہ حالت میں ایک خیال، روش اور عمل سے ربط اور اعتبار۔ اور ان باتوں کے قایم ہونے کے بعد وضع لفظوں میں تواریث، فضا اور تربیت ہے جسکے بعد کسی کے خصائل پر اجتہاد کی آسانی ہو۔ اور کیوں؟ جب یہ باتیں کسی کی جزو عادت ہو جاتی ہیں تو باتیں نہیں بلکہ نگاہ ہیں اس شخص

قائم ہو جاتا ہے، ایک انسان کے خصائل کا اپنے شخص کی بنیاد پر اثر ہوتا ہے۔
 جس طرح کوئی فرد اپنی کسی خصلت کے لئے ممتاز ہوتا ہے اسی طرح قوم کا مجموعی جسم بھی کسی
 خاص خصلت میں ممتاز ہوتا ہے۔ مثلاً قومیں ہیں جو اپنی شجاعت اور کشتی کے لئے ممتاز
 ہیں، قومیں ہیں جو اپنی نرمی اور بردی کے لئے ممتاز ہیں، قومیں ہیں جو نرمی اور سختی کی بین
 بین حالتوں کے لئے مشہور ہیں، قومیں ہیں جو اپنی شیریں بیانی اور اجمہ کی خوبصورتی کے
 لحاظ سے زبان زد ہیں۔ اسی طرح کوئی قوم مکر و فریب، کوئی عقل اور کوئی مشقت کے لحاظ سے
 نوک زبان ہے۔ یہ منفرد خوبیاں یا کمزوریاں ہیں کسی قوم یا قوموں میں۔ ایک یا ایک سے
 زیادہ بھی پائی جاسکتی ہے، اور وہ بہت سی خوبیوں کا مجموعہ ہو سکتی ہے، یا بہت سی
 برائیوں میں ممتاز ہو سکتی ہے۔ ایک تیسری حالت بھی ہوتی ہے جسے مرکب خوبی کہا جاتا ہے
 اور وہ یہ ہے کہ اُس میں متضاد حالتوں کی خوبیاں پائی جائیں، مثلاً شجاعت کے ساتھ رحم اور
 فراخ دلی کے ساتھ احتیاط یا احتیاط کے ساتھ فراخ دلی، صاف گوئی کے ساتھ تمیز وغیرہ وغیرہ
 اس کے عکس میں نامردی کے ساتھ بے رحمی، جھوٹ کے ساتھ فریب، بے اعتباری کے
 ساتھ خیانت اور نا احسان شناسی کے ساتھ ظلم، ہے۔

کسی فرد میں کسی یا چند خوبیوں کا پایا جانا کسی اتفاق کا نام نہیں ہے، بلکہ اُس شخص کے
 ارادہ، خیالی اور عمل کا اُس مخصوص روش پر چلنا اور اُسے اپنا جزو کر لینے کا نام ہے، اور
 اس روش کا قائم ہونا کچھ وقت کا محتاج ہے۔ اور جب کسی منفرد شخص میں کسی روش کا قائم ہونا
 ایک عمل کا کام ہے، تو قوم جو افراد کے مجموعہ کا نام ہے، لازم زیادہ وقت، قوی تر فضا اور
 تربیت کی محتاج ہے، کہ وہ کسی خاصہ یا خصائل کے لئے مشہور ہو، اور کوئی شخص قائم کرے
 اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ خصائل یا خاصہ کوئی گوند یا لاکھ نہیں ہے،
 کہ ایک دفعہ لپٹا تو چھوٹنا نہیں جانتا، بلکہ قوم اور فرد کا خاصہ دریا کی طرح جنم و مد میں مبتلا
 رہتا ہے۔ کبھی گھٹتا ہے اور کبھی بڑھتا ہے۔ اس کے لئے قوموں کے عروج و زوال پر غور کرو

تو تم پر واضح ہو جائے گا کہ تو میں جس وقت بڑھیں ظاہر بڑھنے کے قبل وہ کچھ اسباب میں گھبریں تھیں جو خضائل سازی کر رہے تھے، اور جب اُس کے نشوونما کی ایک حد پہنچی تو قوم بڑھ گئی۔ اس کے بالکل جسب کسی قوم کے زوال پر غور کرو گے تو ہماری سمجھ میں آجائے گا کہ وہ قابل تعریف خضائل سے یا تو لاپرواہ ہو گئی تھی، اس پر ہنسے لگی تھی، یا اُس کے احساسات کمزور ہو گئے تھے۔ اور اگر نظر کو وسیع کرنے اور دُور جانے میں تردد ہو تو اپنے ہی کو دیکھ لو کہ تم کیا تھے؟ اور کیوں تھے؟ کیا ہو سکتے ہو؟ اور کیوں نہ؟

ساتھ ہی ساتھ اِس پر بھی خیال کر لو کہ ایسی تو بہت کم مثالیں ہیں کہ کسی ترقی یافتہ قوم نے بے غرضی سے کوئی بے خضائل یا کمزور خضائل کی قوم کو صاحب خضائل اور قوی تر خضائل کی قوم بنایا ہو، بلکہ اس کے بالکل تم ایسی مثالیں ہر زمانہ میں پاؤ گے کہ ایک قوم دوسری کو کس طرح پست تر بنانا چاہتی اور اُس کے قومی خاصہ کو محو کرنا چاہتی ہے، یا کمزور لڑتی جاتی ہے کہ وہ رقابت یا مقابلہ کے قابل نہ رہ سکے۔ میں یہ بھی نہ بھولونگا کہ قوموں کے ساتھ نہ خدا کی عزیزداری ہے نہ عداوت، تم یا کوئی اور اُس وقت سے بڑھیکہ جو وقت سے قانون ترقی کا ساتھ دیگا، اور تم یا کوئی اور کسے گا جس وقت سے اُسے پست روی کی عادت ہو جائے گی۔ یہ غلط ہے کہ چونکہ کوئی بڑھ کر گھٹ چکا اب وہ نہ بڑھیکہ، یا چونکہ کوئی گھٹ کر بڑھ چکا اب وہ زوال سے محفوظ ہو گیا۔ نہیں! کسی کے بڑھ جانے یا گھٹ جانے کے بعد قانون عروج و زوال ملحق یا ختم نہیں ہو گیا۔ بڑھو اگر تم چاہو، گھٹو اگر تم چاہو!

”اگر چاہو“ میں بخدا نہ گنجدین نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم ایک وقت میں کھڑے کھڑے ایک پاؤں اٹھا سکتے ہو، دونوں نہیں اٹھا سکتے۔ اور جس وقت کوئی سمجھتا ہے کہ وہ ایک پاؤں اٹھا سکتا ہے، یا دونوں ساتھ اٹھا سکتا تو گر پڑے گا، وہ ایک قانون سمجھتا ہے اور قانون کا اعتبار قائم کرتا ہے۔ نوع انسانی نے ایک زمانہ مدید سے خدا کے قانون کا تجربہ کیا ہے، تجربہ نے امتیاز پیدا کیا ہے اور اب یہ کہنے کے قابل ہے کہ سنت الہی میں جہان تک انسان جانتا ہے

تبدیلی نہیں ہو کرتی۔ یہ نہیں ہوتا کہ سب میں جوار کا دانا اور جوار کے گھیت میں بجر عمار کا موتی ملے۔ قانون نے ہر ایک کے لئے ایک حتمی مقرر کی ہر جس کے اندر وہ کام اور نتیجہ کا اُمیدوار ہو سکتا ہے۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چیز میں ایک قانون ہے تو عروج و زوال کے لئے کوئی قانون سمجھنا یا اس قانون کے پیدا کئے ہوئے نتیجہ کو ابد الابد تک کے لئے مصلوب کر دینا قانون کی غلط فہمی عروج و زوال کی فطری روش میں اس وقت غیر فطرت شامل ہو جاتی ہے جب اس غیر فطرت کی رقابت شامل ہو جاتی ہے اور جس وقت رقابت غلبہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور یہ غلبہ سیاسی دہم غلبہ کو ظلم کی حیثیت میں مسخ کر دیتا ہے اس وقت عروج کی کوشش کے لئے سہوی رکاوٹ اور زوال کے عدم انسداد کی لاپرواہی زوال کو سر بل کر دیتی ہے جو معدومیت پر منتی ہوتی تم نے سنا ہوگا کہ کبھی بابی اسیری اور ہن قومیں تھیں جن کے نام سے وہ قومیں کانپتی تھیں، جہاں تک اس زمانہ کے سلسلہ آمد و رفت کے لحاظ سے ان کا قدم پہنچ سکتا تھا۔ کیا ہوئیں؟ ان سے قومی ترا قوام نے کچل دیا، یا ان میں معدوم ہو گئیں، جو ان کے بعد بڑھیں یہندوستان کی ناقابل س قومیں کون ہیں؟ وہ جن پر آریوں کا دست تسلط دراز ہوا، اور ان کے فاتحانہ طغیان نے مغلوب قوم کی معاشرت کو ذلیل سمجھ کر، یا انہیں آئندہ نہ بڑھنے دینے کی مصلحت سے معاشرہ ناپست تر سمجھا، اور ان کے لئے ایسے قوانین بنا دیئے جو انہیں ایک جگہ کاڑ دین۔ پھر بھی انفرادی عروج و زوال سے ان کی تعداد بڑھتی اور گھٹتی رہی۔ لیکن چونکہ آریوں کا نظام سیاست دائمی نہ تھا، ناقابل مس قومیں اپنے کو اپنی ذلیل حالت سے نکال سکتی تھیں اگر انہیں فکر ہوتی۔ نکل گئے بنھیں فکر تھی۔ اور اگرچہ آریوں کا سیاسی نظام دائمی نہ تھا لیکن ان کے تسلط نے جو نظام معاشرت قائم کیا تھا وہ اس سے زیادہ دیر پاتا تھا، اور یہ نظم اپنی قائم شدہ حالت، جماعت، روایات اور مذہب کی بنیاد پر اپنے سلسلہ کو جاری رکھیگا جب تک کہ اس میں قوت رہیگی۔ ورنہ وہ شکست ہو کر ناقابل مس میں شامل ہوگا اور پھر وہاں

عروج کی خواہش قومی ترنظام میں جذب کرتی جائے گی۔ آری قوم نے مذہب کی لچک کو بھٹا رکھا ہوتا، یا انسانیت کو زیادہ دخل دیا ہوتا تو آج ہندوستان کی ناقابل مس قوم نہوتی، یا دوسرے لفظوں میں آریٹ قومی ترہوتی، کیونکہ اُس میں قوت جذب پیدا ہو جاتی۔ اس تمام بیان سے میل یہ مطلب ہو کہ وہ انفرادی عروج و زوال ہو یا قومی، اُسے خصائل سے بڑا ربط ہے۔ وہ قوم زوال پذیر نہیں ہوتی جس کے خصائل درست ہیں اور وہ قوم بڑھتی سکتی جس کے خصائل یا ترقی کی بنیاد درست نہیں ہے۔

ان مختصر اشاروں میں میرا قلم پھسل نہیں گیا، بلکہ اس قدر چلا، جس قدر چلنا چاہیے تھا اور اب اس کے بعد مجھے 'محین اور خصائل سازی' کے سمجھانے میں نسبتاً آسانی ہے۔ اب قبل اسکے کہ میں اپنے عنوان کے دونوں پہلوؤں سے بحث کروں میرے مضمون کو سرزمین عرب کی طبعی حالت، اور قوم عرب اور اُس کے خصائل سے بحث کی ضرورت ہے۔ یہ ایک روندی ہوئی زمین ہے، جس سے میں بجز چند الفاظ اور چند اشاروں کے کچھ نہیں چاہتا، اور یہ بھی اس لئے کہ میں آئندہ کچھ کہنے کے لئے بعض خیالات کو زندہ کر دوں جس سے میرے مضمون کے سلسلہ خیالات میں شکستگی نہ ہو۔

جغرافیائی حیثیت سے ایک ملک جس کا موقع تھا کہ اُسے نہ صرف رومی، یونانی، ہندوستانی اور ایرانی قوموں سے کسی حیثیت کا ربط ہوتا، بلکہ عرب کے بنا در وہ پل ہوتے جس طرح سے یورپ اور افریقہ مشرقی ایشیا سے اور مشرقی ایشیا افریقہ دیورپ سے ملے ہوتے۔ گذرگاہ جس سے میری غرض دنیا کی مشہور قوموں سے ربط اور شناسائی ہے اور قومی تعارف کے بعد میری غرض یہ بھی ہے کہ ان میں ہر ایک کا تمدن، مذہب، اخلاق اور ان سب سے ملکر جس کا جو خاصہ تھا اُس کا ایک دوسرے سے تضادم ہو رہا تھا، اور ایک محسوس یا غیر محسوس متوج کام کر رہا تھا۔ ابھی درجہ سے بحث نہیں ہے۔ اس متوج کا اثر اگر نہ ہوتا دیکھا جائے تو میں یہ کہنے پر مجبور ہوں اور میں غالباً سند دیسکوں کا کردہ شمار کے قابل نہ تھا۔ اس کی کچھ وجہ بیان کرونگا تین ہزار

برس میں چند یہود قبایل کا ہونا اگر وہ عرب بھی ہوں، زیادہ قابلِ تعریف نہ تھا، اگرچہ آپ کے آثار میں کہ بیت المقدس کی تاخت کے وقت اکثر یہود وہاں سے منتقل ہو کر یہاں آ گئے تھے۔ اُن کے علاوہ انکا دُکا عیسائی۔ یہ خارجی اثر تھا اگر اثر کہا جاسکے۔ مذاہب خارجی عرب پر کیا اثر کرتے جبکہ عرب کے مشرکانہ اصول اُن میں مراپت کر جاتے تھے۔ صابین دور کے نہ تھے۔ بُت پرستی اور باہم فطرت کا دوسرا نام ہے۔ اس کے لئے نہ کسی مقام کی ضرورت ہے نہ زمانہ کی۔ اگرچہ یہ بڑی حد تک صحیح ہے کہ توین اپنے مذہب سے سچی جاتی ہیں، لیکن ہم جن باز کے قریب کا ذکر کر رہے ہیں اُس میں عرب کا مذہب اگر کچھ ہو، اُس کے خاصہ سے کوئی نسبت نہ تھی۔ اور وہ مذہب کو اپنے خاصہ کے موافق موڑتا تھا نہ کہ مذہب اُس کے خاصہ کو موڑتا ہو۔ عرب بھیڑنا پسند نہ کرتا۔ یہ اُس کے خاصہ کے قطعاً مغاڑ تھا۔ وہ بھیڑتا تھا ہی نہیں کہ بھیڑ یا بنا اُس کے لئے کوئی فخر کی چیز ہوتی، اور یہ اُس کے شجاعانہ وحشت کے بالکل منافی تھا کہ وہ بھیڑ یا ہو کر بھیڑ کا بھیس اختیار کرتا۔

یہود عرب کی خصایل سازی نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے کہ اُس وقت صدیاں گزری تھیں کہ اُن کے دماغ سے حکومت کی بگڑ گئی تھی، اور جب سلطنت نہ تھی تو یہ سپاہی نہ ہو سکتے تھے، کیونکہ مذہبِ حب وطن اور حب قوم کا وہ درجہ تھا جو آزاد قوم میں ہونا چاہیے۔ حب مذہب جیسی کچھ اُن میں تھی وہ بجائے خالص یہودیت کے ایک زمانہ سے شرک میں رنگی جا چکی تھی۔ یہود عرب میں متناہی شخص قائم کر سکے وہ کچھ تو عرب کی طوائف الملوکی اور کچھ اپنی تجارت اور سود خواری کی بدولت۔ یہود عرب کے حاکم نہ تھے کہ مجبوراً مفتوح قوم کی کسی حیثیت کی خصایل سازی کا ذمہ لیتے نہ وہ معاشرتا ایسی درگزر والی قوموں میں سے تھے کہ دوسرے انسان کو بجا خدا کا بندہ سمجھتے۔ اب صرف اضطرابی معاملات جس قدر اثر کرتی وہ بجز اسکے کہ خود غرضی ہوتی، کبھی عرب کو کھلے ہوئے سینے سے اُن کی طرف نہیں بڑھا سکتی تھی۔ قرآن مجید میں تم پاؤ گے کہ اہل کتاب عربوں کو کھیا خیانت وغیرہ کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جملائے عرب کے ساتھ

اس طرح کی معاملت کرنا کوئی گناہ نہیں ہے۔ اپنے مذہب ترہونیکا کیا اچھا ثبوت اور بناو تھا !
 اویسج تو یہ ہر کہ یہود کی تاریخ یہ نہیں کہتی کہ اپنے خصائل میں جنس کے قابل نہ تھی۔ کب انھیں
 موقع ملا کہ وہ بعل اور اشتروت کی طرف نہ بھگے اور زہرہ کی قاص کنیزوں کے ذریعہ
 نہو گئے ؟ اور کب باوجود سخت احکام کے انکی لگام ڈھیلی ہوئی اور انھوں نے بت پرستی شروع
 نہ کر دی ؟ میں اس پر آمادہ ہوں کہ ان کی یورپ کی تاریخ کو ایک بڑی حد تک مستثنیٰ کر سکوں
 یا اشاعت اسلام کے بعد انھیں قومی ترمو جہ پاؤں۔

نہیجیت کی تثلیث اُسے اپنا فریضہ کر سکتی تھی۔ تین سو ساٹھ خدا کیا کم تھے جن میں اضافہ کی
 گنجائش تھی۔ اگر اُس سے کہا جاتا "تیں تلوار کرنے آیا ہوں"۔ خوب ! وہ تمہاری شمشیر زنی کا
 درجہ بڑے غور سے دیکھتا اور اُسے پسند آتا تو اُس کا طبعی میلان قبول کر لیتا۔ لیکن اُس سے
 کہے کہ "تیں ساس بہو کو لڑوائے آیا ہوں" تو وہ فوراً بدل جاتا۔ وہ عورتوں کے ساتھ کسی
 ایسے معاملات کو جائز نہ سمجھتا تھا، اس لئے کہ عورتوں کی حمایت اور ان کے استغناء پر جان بڑھ
 کیلئے آمادہ ہو جانا ایک لامل معلوم زمانہ سے اُس کے صحیفہ عزت میں داخل تھا۔ کہو کہ "میں صلح
 کرنے کو آیا ہوں" اور وہ نہ صرف دونوں فخرات میں تضاد پائیگا، بلکہ اُس کے مزاج اور
 اُس کی روایات کے موافق بھی نہوگا۔ کہو کہ "ایک تھوڑا کھا کر دوسرا کال بھی سامنے کر دو" اور
 اسکے لئے تیار رہو کہ کیا جواب دیگا !

اُسکا خاصہ تو یہ ہو گیا تھا کہ اگر کوئی کانٹا چھتا تو جھکنا عجیب سمجھتا تھا، اور اگر دشمن اُس کے
 کسی عزیز کو قتل کرتا تو اپنا رونا کھال حمیت، دشمن کی شہادت کے خوف سے، انتقام لینی تک
 ملتوی رکھتا تھا۔ دورنگی اُسے پسند نہ تھی۔ اُسے نیزہ گھوڑا اور اس پر زندگی کی عادت
 تھی۔ اونٹ یا خچر نشان صبح یا عورتوں کے لئے تھا۔

زر دشمنیت اُسے اپنا گرویدہ بنا سکتی اگر کسی کتب مقدسہ کے "جانور خدا" عرب میں اگر اُس کے
 پیٹ میں اُتر جاتے۔ کہاں اُسکی سیاب خضالی اور کہاں بارہ ہزار برس کا انتظار کہ جب ایندھن

پائیک تو نیکی غالب ریگی! رہا اُس کا سب سے خلوص سے سجدہ کرنا جو اُس کے معذہ کا لحاظ کرتا وہ اس کے لئے مجبور تھا۔

سرزمینِ عرب کی طبعی حیثیت پہاڑ، ریگستان، صاف آسمان، خشکی، بے گیاہی، گوشہ خیزی، کمی معیشت، اکثر شکار کی سخت کوشش کے بعد حصولِ غذا، حصولِ معیشت کے لئے کرے سفر، جنگ، ان باتوں نے اُسے درشت، بیخوف، سیدھا اور شجاع بنا دیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ شریف سپاہی نہ ہو، لیکن بہادر ضرور تھا۔ ایسا نہ تھا کہ بھیگی بتی بنا رہتا، اور اُسکی غرض اور اس کا مزاج اسوقت ظاہر ہوتا جب کمزور چڑیا اُس کی زد کے اندر آ جاتی، یا وہ پھبتیاں کرتا رہتا اور فریب کی ہرزاد کو تدبیر نہ کھتا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ سپاہی (اعلیٰ مفہوم میں) تدبیر ہو سکتا ہے، تدبیر پست تر اخلاقی مفہوم میں، سپاہی نہیں ہو سکتا۔ اگر عرب سپاہی تھا، طبعاً پچھیت نہ تھا تو اُس کا شجاعت پسند ہونا اُسے صحیح مفہوم کا جیسا بھی تدبیر بنا سکتا، پست اور فریادہ روش کا تدبیر نہیں بنا سکتا تھا۔ وہ سپاہی تھا، ذوقِ فول نہ تھا۔ اور اگر وہ ایسا تھا تو لازماً اُس کے لئے ایک اصول اور ایک مذہب چاہیے تھا جو اُس کے بہترین خاصہ کے موافق ہوتا۔ ورنہ مجبوریاں اُسے ایسے اصول کی طرف لیجا تیں جو مغایر ہوتے تو کبھی مذہب اور خاصہ میں مطابقت نہ ہو سکتی۔ یا تو عرب کا خاصہ مذہب ضائع کر دیتا یا مذہب جو بکے خاصہ کو کھو دیتا اور کون جانتا ہے کہ اُس میں جو کچھ اخلاقی یا معاشرتی بُرائیاں داخل ہو گئی تھیں وہ خارجی اثرات سے نہ تھیں۔

کرتہ قدرت چاہتا تھا کہ یہ قوم دنیا میں کچھ کرے، لیکن کرتی کیسے؟ اُسے آپس میں لڑنے سے کب فرصت تھی، اُسے بے سود افتخار سے کب وقت دیا تھا کہ وہ کوئی بہتر بات سوچتا اور مذہب کے گب اُس پر اثر کیا تھا کہ اُس کے لئے کوئی دلنشین قانون ہوتا، وہ کیا کرتا، بجز اس کے کہ اپنے جوش میں سوم کی طرح چکر کھاتا۔ اُسے فساد خانہ جنگی، قتل، اختلاف، لالہ جہی اور بے اخلاقی کا پورا تجربہ تھا۔ یہ ہوا اور جب کے لئے سب کچھ ہو۔ کون کرتا جب سلطنتیں نہ کر سکیں؟ کون کرتا جب صدیوں کے نظامِ روحانی نہ کر سکے؟ صدیوں میں نہ کر سکے! لیکن ہونے والا تھا سلطنت

سے نہیں، روپیہ سے نہیں، تلوار کی بارٹھ سے نہیں، نیزے کی اینوں سے نہیں، گوشت اور خون کے اٹھیں کے ایسے انسانی شکل کے انسان سے! کسی پارلیمنٹ کے نہیں، کسی نظامِ شخصی بلکہ پوری نہیں، ایک فرد واحد سے!!

ذرا سوچو۔ سلطنتیں بنیں اور بگڑیں، ملکوں اور قلمیوں پر روحانی سیلاب آیا، صدیوں پشتیر کی بنی ہوئی سلطنتیں، قومیں اور اُن کا تشخص فنا ہو گیا، وہ بدل گئیں۔ زمین، آسمان، فضا، تواریخ، خاصہ روایات، سب بدل گئے۔ کس نے بدلا؟ کیونکر؟ ایک شخص نے! باریکی کی لاٹ یا نور کے ستون سے؟ سونے اور چاندی کی دلفریب مدد سے؟ دھمکی، خوف، یا فریب سے؟ نہیں، ہنسی، لفظوں سے، دو حالت سے جسے خاصہ کہتے ہیں۔ یہود کا بہترین ربی، مسیحوں کا بہترین ڈاکٹر آف ڈوینٹی، سائنسٹسٹ فلسفی اور بایو لوجسٹ کو یقین نہیں دلا سکا کہ کیونکر نور کا ستون موجود ہو گیا تھا اور کیونکر کوئی مردہ زندہ ہو سکتا تھا؟ لیکن اُن سے کہو کہ افراد اور قوموں نے خاصہ میں تغیر پیدا کر دیا، مردہ قومیں جی اٹھیں، کابل اور لاپرواہ کا راما اور ذی ہوش ہو گئے، شیطان کے استاد ولی اللہ بن گئے اور وہ سر جھکا دے گا۔ اس لئے کہ یہ حالت انسان کی نگاہ سے قریب تر اور دل کے احساس سے نزدیک تر ہے، جس میں کسی ساحرانہ فریب یا شبہ کی گنجائش نہیں۔

خاصہ کی حرارت تھی جس نے عرب کو موم بنا دیا، اور وہ موڑا گیا جس طرح اُس کا موڑا جانا ایک فرد کے لئے ضروری تھا، جس میں ایک حقیقی مفہوم کے انسان کی طرح زندگی بسر کر نیکی صلاحیت پیدا ہو جاتی۔ ذرا سی شرح! یہ تو گوتم بدھ سے لیکر دنیا کے سب سے بڑے جاہل اور گناہگار کو معلوم ہو کر نیکی اچھی چیز ہے اور بدی بُری، یا عقلمند کی بات سُنو اور انوارِ احمق سے بچو، لیکن ایسی ذات کس قدر میں جن میں خوبیاں ہوں ہو کر اُن کا ایک جزو بن گئی ہوں اور اُنھوں نے ایک اعتبار پیدا کر دیا ہو، اور جاننے والوں کے خیال سے دُور ہو گیا ہو کہ ایسا شخص کبھی اپنی روش سے ہٹ سکتا ہی۔

الحق! وہ ذات اقدس تھی محمد مصطفیٰ اصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جس نے قبل نبوت اپنی عقل
 صداقت صحیح تصفیہ، دیانت اور امانت کا یقین دلادیا تھا۔ گھر کے لوگوں میں تجربہ کار حضرت
 ابو طالب سے زیادہ جاننے والا اور زیادہ معترف دوسرا نہ تھا۔ کچھ باہر حضرت خدیجہ خنیمہؓ
 اور فرست کی ایسی شیدائیں گئیں کہ خود سے تحریک عقد کی۔ اور صداقت کا وہ مجمع قابل تھا جو
 اُن کے دعوے نبوت کا بھی قابل نہوا تھا اور این تو نام ہی پڑ گیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ہی ساتھ جن
 اور رسول کی حمایت ضغفاء سے بھی لوگ ناواقف نہ تھے۔ شاید کوئی انسان مجھ سے یہ نہ پوچھ
 کہ رسول کی جرأت کا ذکر کرو۔ مؤرخین جانتے ہیں کہ کیسے کیسے وقت پڑے اور گویا ہزار ہا
 دشمنوں میں تنہا رہ گئے، جگہ چھوڑنا کیسا، ہمیں اور ہر جاننے والے کو، عام اس سے کہ مسلم ہو
 یا غیر مسلم علی کی شجاعت کی قدر ہے، کہتے ہیں کہ خطرہ کے وقت ہم لوگ رسول کی پناہ لیتے تھے۔
 لیکن اس سے عظیم تر جرأت یہ تھی کہ ہم تنہا دنیا کا خیال پلٹ دینے کے لئے کھڑے ہوں گے۔
 بت کیطرح عقاید ہنود میں ترمیم نہیں، مسیحیت کی طرح یہودیت کی شرع کا اختلاف نہیں، بلکہ عالمگیر
 بت پرستی اور شرک کے خلاف اعلان۔ دو بیانی اور نکتہ رسی یہ تھی کہ قیصر اور کہاں ایران کا تاج
 و تخت دکھا دیا تھا۔ انسان شناسی یہ تھی کہ قانون بنا دیا جو احوال مقام اور زمان پر حاوی ہے
 تھا اور رہیگا، جب تک انسان انسان رہیگا۔ اب شاید مجھے مثالوں میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں
 ہے اور صرف یہ کہ دنیا پر کہ یہ اکیلا نفس مقدس وہ گوارہ تھا جس میں قوم پل رہی تھی۔ ایک
 دار التربیت تھا جس میں قوم کی تربیت ہو رہی تھی۔

عوب کیونکر بدل گیا؟ قلب ماہیت کا معجزہ کیونکر ہوا؟ اس طرح کہ عوب کی تمام باتوں کی
 قائم رکھا، بلکہ موقع موقع سے اس کی داد دی۔ اُس میں اچھی باتوں کو اُن کی رلکھو پھینچو، ایا، اُن کی
 قدر پیدا کر دی۔ ابتداء مشہور بُرائیوں کو نہ کرنے کا حلف لے کر بُرائیاں پھینچو ادیں اور خدا
 خوف اور محبت کے قطرے اس طرح پڑکائے کہ عوب کے بہرے کان سننے لگے اور اندھی آنکھ
 دیکھنے لگی۔ کوئی ایسا اصول نہیں بنایا کہ چونکہ کوئی امیر ہوا اسلئے مستحق عذاب ہو نہ افلاس کو

انسان کی حقیقی ذلت سمجھا۔ ایک کو دوسرے کے اور اپنے حقوق بتا دئے اور دونوں سے کھدیا کہ تم میں خدا کے نزدیک زیادہ مکرم وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔ نتیجہ کیا ہوا؟ یہ کہ ایک وقت مسلمان اپنے مصلے پر خدا کا عاجز بندہ تھا، تو دوسرے وقت اُسے اپنی بیٹیہ پر اپنے اہل و عیال کی معیشت کے سامان لانے میں شرم نہ تھی، تیسرے وقت وہ تجارت کرتا تھا یا زمین کھودتا تھا، اور جو تھے وقت میدان جنگ میں وہ خوفناک سپاہی تھا جسکے سامنے کیاں ایران اور قیصرانِ روم کی فوجیں کار آمد ثابت نہوئیں۔ میں فوجیں کہہ رہا ہوں جسکے معنی یہ ہیں کہ کسی قوم کی فوج اُس کی ہر طرح کی ترقی کا لب لباب ہے۔ اس سے سمجھا جائیگا کہ اُس کا نشوونما، جسمانی، دماغی، اخلاقی، حبِ قوم، قربانی کہاں تک ہے۔ کہاں تک وہ فوج مصائب برداشت کر سکتی ہے، اور کس طرح اپنے عزیز احساسات کے لئے، خوشی سے ہر صیبت کو پہنچ سکتی ہے۔ اُس فوج کا دل کس قدر قوی ہے اور اس میں کس حد تک قلبی یکجہتی ہے۔

اس کا نتیجہ تھا کہ چند سال بعد اسلام کا سرچہ السیرا تہذہاروں میل میں پھیل گیا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ کسی اہرامِ مصری کے کھودتے وقت ایک کتبہ نکلا تھا کہ ہم نے چھ برس یا چھ مہینے میں اسے بنایا تھا، تم اسے ساٹھ برس میں کھود ہی دو! بڑی حد تک اسے اُن خصائل سے مماثلت ہے جو مسلمانوں میں پیدا کئے گئے تھے۔ سلطنتیں بنتی اور بگڑتی تھیں اور بھٹی ہوئی آگ پھر بھڑک کر ایک دوسرے خطے میں زمین کو روشن کر دیتی تھی۔ یہ آگ کیا تھی؟ کوئی اتفاق تھا؟ کوئی بڑی قسمت تھی؟ کسی دماغ کی کارگزاری تھی؟ یا کوئی خواب تھا جو پورا ہونا تھا؟ یہ سب کچھ تھا، خصائل کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، روایات سامنے آ جاتی تھیں، بلند توریث میں پہچان ہوتا تھا، اور جب یہ پُرانے سامان مہیا ہو جاتے تھے مسلمان پھر اپنی گری ہوئی حالت سنبھل جاتے تھے۔ عجب متعدی مکتبہ تھا کہ عربوں سے ایرانیوں، افریقیوں، تاتاریوں، یورپیوں اور ہندوؤں تک منتقل ہوا، اور ہر ایک میں اُسی ذاتِ اقدس کا جلوہ دکھائی دے گیا جو ایک زمانہ تک غار حرا میں اپنے کو چھپائے رہی!

مجھے افسوس ہو کہ کئی وقت اور مشورہ کے جتنہ کے لحاظ سے ایسے دلچسپ مطالعہ میں قصرت نظر کی
مجبوری ہو اور اب میں کئی کرنے کے لحاظ سے یہ کہہ رہا ہوں کہ دیکھو کہ اُس حیرت انگیز ذات نے
کیسے کیسے لوگ تیار کئے جسے لوگ قتل کرنے آتے تھے اور غلام بن کر رہتے تھے، بُرا بھلا کہتے
اور جب توجہ کے عالم میں مس ہوتا تو انھیں بجز روح کے چارہ نہ تھا۔ اس بلندی خصال نے
ہادی عالم کے خیال کی پاکیزگی، ارادہ کی قوت، نفس کی ذکاوت، احساس کی لطافت اور
ادراک کی تیزی پر کیا اثر کیا تھا، اس کے آثار اُس بزرگ کی زبانی کافی ملتے ہیں جسے مطالعہ
کافی موقع تھا، اور تاریخ کو تاریخ کی طرح پڑھنے والے بھی اپنے مراجع کے موافق نا آشنا نہیں ہیں
لُب لباب یہ ہو کہ نئے آدمی پر ہیبت طاری ہوتی تھی اور جوں جوں واقف ہوتا جاتا تھا محبت
بڑھتی جاتی تھی۔ لہذا ایسا صاف جس کے سمجھنے میں کسی صحیح الدماغ آدمی کو غلطی واقع ہو۔
خوش نصیب تھے وہ لوگ جو ایسے نفسِ عظیم کے سایہ میں تھے، اور خوش نصیب ہے وہ قوم جو
یہ کہے کہ ایسا بزرگ ہمارا ہی جس سے ہمارے آبا و اجداد کی اُس انتہائے جو اُس وقت تھی اس
فاتِ عظیم کو دیکھا اور اثر لیا، اور وہ اثر کسی حیثیت کے کچھ نہ کچھ ہم تک منتقل ہوتا رہا ہے، اور موٹے
موٹے واقعات نے سمجھنے کا ذریعہ چھوڑا ہے، اگرچہ خصال کی اتاری نے اُس بلندی خصال کے
صحیح احساس کے قابل نہ رکھا ہو۔ یہ تھے حسین کے جد بزرگوار اور وہ تھی حسین کی قوم جن میں
شرافت کے اعلیٰ احساسات اُس شلخ میں خصوصیت سے پائے جاتے ہیں جسے بنی ہام کہتے
ہیں۔ سلسلہ چاہتا تھا کہ میں حسین کے پدر نامدار، مادر گرامی اور برادر عالی وقار کے خصال پر کسی
حد تک تفصیلی نظر ڈالتا اور اس طرح میرے مضمون کا پہلا حصہ وضع ہو جاتا کہ وہ کوئی نئے اسباب تھے
جو حسین کی خصال سازی میں معین ہوئے۔ بہتر ہو گا کہ میں اسے کسی مناسب وقت کے لئے اٹھا رکھوں
اور جسے میں نے کسی حد تک کہیں دکھایا بھی ہے۔ حامی اسلام کے متعلق اس قدر کہنا شاید کافی ہو
کہ ایک ذات جو یہ کہہ سکتی ہو کہ اگر ذریعہ ہی تدبیر ہے اور میں ایسا کر سکتا تو سب سے بڑا مدبر ہوتا
یا جو ایسے موقع پر جس کیلئے قوموں نے جائز رکھا ہو کہ ”جنگ میں سب جائز ہے“ وہ اس پر خوش تھا

کہ ہم حق سے نہیں ہر وہ جو ابن عباس کے ایسے دعوے کو کہ میں ایسی ایسی ترکیبیں کروں کہ فلاں شخص سوچتا ہی رہ جائے، یہ کہہ کر دکھاتے ہیں کہ مجھ میں نہ تمہاری خصلتیں ہیں اور نہ فلاں کی، ہو یہ کہہ سکتا کہ مجھ سے یہ ممکن نہیں کہ میں چوٹی کے منہ میں سے ایک ذرہ بہ جبر چھین لوں جو مسلمانوں کے آپس کے کشت و خون کے خوف سے اپنے جائز حوصلوں کو نگام دیتا ہو اور مختصر لفظوں میں جس کی تعریف اس کا دشمن اور خود قاتل کرے۔ محال تھا کہ ایک ایسا شخص انسان اور اس کے خصال سے ناواقف ہوتا۔ اس بزرگ کے مشہور خطبات میں اکثر وہ ہیں جو انسان کا مطالعہ کہے جائیں۔ دیکھو کہ کہیں مخفی سے مخفی غلطیوں پر متنبہ کیا ہے اور کیسے لطیف احسانات پسندیدہ کی طرف رغبت دلائی ہو۔ مبالغہ سے کہیں کم ہی یہ فقرہ کہ یہ بزرگ شرج رسول تھا۔ یہی جو رسول کی اس طرح متابعت کرتا تھا جس طرح اونٹ کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے پیچھے پھرتا ہو۔ یہی تربیت کا اصل اصول ہو۔ سیکھو تو سکھانے کے قابل بنو گے۔ سوچنے کا صحیح طریقہ سیکھو اور پھر تم نہ صرف غلط روٹی خیال سے محفوظ ہو جاؤ گے، بلکہ متناکر عمل پر اس کا عکس پڑے گا اور علیٰ ہذا القیاس۔ اس ذاتِ اقدس نے بھی مثالی لوگ بنائے جنہیں اس بزرگ کے دنیا سے گزر جانے کا ایسا غم تھا جیسے ماں کی گود میں بچہ فوج کیا جائے کیوں؟ غصہ میں علم، انصاف، مظلوم کی حمایت، حق گوئی اور اس میں ملامت لا پر وائی، درگزر، ایسا بزرگ اس قابل تھا جس کی محبت میں شہید ہونے والوں کی تعداد دنیا کے کسی مصلح اخلاق سے کم نہ ہوگی اگر زیادہ اور عظیم تر نہ کہی جائے۔ جبکہ محبتِ خون نے آزمائی اور پوری تھی کیوں؟ بلندی، خصال۔ نیف جس کے حلیہ کا ایک عکس۔ ”کنیز لبتج“ ہے ضلیع ہو سکتا تھا! جس کی ہیبت سے لوگ بات نہ کر سکتے اور اس کے دشمن اپنے اوپر غالب آنے میں اسکی مدد کرتے۔ یہ نہا حین کا پدرِ عانیِ مقدار۔

حسینؑ کی مادرِ گرامی وہ مخم جسکی ہادی عالمِ عظیم کر سکتا، جس کا ایک لقب ”ام ابیہا“ تھا، جو اہل صفہ کے لئے اپنے آرام و درنیت کی چیزیں قربان کر سکتی، جو خلقِ اللہ کے لئے اپنے کو

نہیں اپنے دو چاند کے ٹکڑوں کو بھوکا رکھ سکتی، جو اگرچہ ملاحظہ فرما سکتی ہے کہ وہ چسپنیرین
انسان کے آرام و آسائش کے کام آ سکتی ہیں ہمارے گھر سے تھیم ہوتی ہیں لیکن کبھی اپنے
پدر بزرگوار اور زوج نامدار کے فیصلہ سے اعراض نہیں فرماتی۔ تسلیم و رضا، اعتبار اور نظر
کہ یہ مخلوقات خداوندی کے کام آرہی ہیں، ہم نے افلاس میں لکھ کر کہ دوسروں کو راحت دی
ہے، غربت کی تلخی کم کرنے کا علاج بہترین علاج جو ممکن تھا، صبر اور شکر اور تکلیفیں۔ بلند
ہوتا ہوا دیکھتی ہیں اور اپنا اثر منوانے میں اپنے کو عاجز پاتی ہیں۔ یہ معظّم اس قابل تھیں جو
فرما سکتیں کہ عفت عورتوں کا بہترین زیور ہے۔ عفت بول رہی تھی۔ دیکھنے والے کہتے
ہیں کہ عادات، رفتار، گفتار اور لہجہ میں اس معظّم سے زیادہ مشبہ بہ رسول کوئی نہ تھا۔
کیسے ہوتا! کوئی تھا کہ سیدۃ النساء العالمین خطاب تھا۔ یہ ذات مقدسہ تھی جبکہ متعلق
ہاشمی ابن عباسؓ ایک موقع پر یہ کہہ سکتے کہ معلوم ہوتا تھا کہ شیعنی مع اپنے بچوں کے بیٹھی ہی
ان کے پاس خمس خیر کہاں! بدر خندق حسین وغیرہ وغیرہ کی عنیت کجا! خود ہیں اور
آسیا سائی۔ لوگ کہتے ہیں کہ خادمہ سے کام لیجئے اور فرماتی ہیں کہ وہ بھی آخر بندہ خدا ہی۔
رحم و کرم نے ان کی صورت میں جنم لیا تھا۔ یہ تھیں وہ معظّم جنہوں نے حسینؑ کی گہوارہ
جنبا نی کی تھی، دودھ پلایا اور پالا تھا۔ تم نے سنا ہوگا کہ رسولؐ کے پاس جبریلؑ آئے اور
انہوں نے حضرت کو خطاب مام حسینؑ کی شہادت کی خبر دی۔ ایک محضر جن پر خود حضرت
فاطمہؑ نے دستخط یا مہر کی۔ اس اشارہ سے۔۔۔ نہ میری غرض ہر کہ تم سے وحی کی بحث
کروں نہ یہ کہنا اور لڑنا، ہر کہ آسمان پر بھی کوئی کاغذ کا کارخانہ ہے جہاں سے محضر کا کلمہ
آتا تھا۔ میرا نقطہ اقدام یہ ہے کہ یہ روایت ہر سمجھ لو کہ یہ استعارہ ہی۔ کیونکہ الفاظ مسائل
ناممکن الحل میں کافی نہیں ہوا کرتے۔ سوچو کہ تم ہوش کے عالم میں ہو، سو نہیں ہے ہو
جلگتے ہو، اور تم پر یہ خیال چمکتا ہی۔ بات ہوئی نہیں ہے، آئندہ کی ہی۔ ہو سکتا ہے کہ
وہ خوف کی ہو، ہو سکتا ہے کہ وہ خوشی کی ہو، اور ہوتی ہے! تم جاننے ہو اور انسانی

تجربہ جانتا ہے۔ اس چمک کے وقت تھیں یقین نہ تھا اور جب بات ہو گئی تو تم نے یاد کیا۔ کیا رسول کے نفس عظیم اور ضمیر مطہر کو اس چمک سے محروم کر دو گے؟ اس کے ساتھ ہی رسول کا نفس معظم اس کا اس طرح احساس کرتا ہے کہ گویا ہونے والی بات ہی۔ تم اسے اتفاق ہی کہو مجھے اس سے بحث نہیں۔ ان تمام مراحل کے بعد اب ہضمیر روشن اپنی لاڈلی بیٹی سے فرما ہی کہ اگر ایسا وقت آئے تو تم حسین کے اصول پر قربان ہونے کے لئے راضی ہو یا نہیں؟ اور سیدۃ نساء العالمین اس بلند غرض پر اپنے گود کے پالے کے قربان ہونے پر راضی ہو جواتی ہیں۔ میں سمجھا چکا، یہ تھیں حسین کی مادر گرامی!۔

حسن و مجتبے احسین کے برادر معظم، اسلام کے شاہزادہ صلح، زبانی نہیں عملی، قوت و اختیار کے باوجود جنہوں نے کئی مرتبہ اپنا نصف مال راہِ خدا میں تصدق کر دی جنہیں یہ گوارا نہ تھا کہ کھانے کے وقت کوئی جانور منہ دیکھتا رہے اور خود کھاتے رہیں ایک نوالہ خود نوش فرماتے ہیں اور دوسرے دیتے ہیں ایک لاثباتی انسان شناس مدبر جو قومی خاصہ کو ملاحظہ فرما کر صحیح نتیجہ پر پہنچتا ہے اور بے سکو شش کے کشت مخون سے خلق اللہ کو محفوظ رکھتا ہے۔ یہ تھے حسین کے برادر معظم جن کے ساتھ حسین بچپن میں کھیلے تھے۔

یہ تھے وہ نفوس اور ان کے مختصر خصائل جن کے سایہ میں حسین حسین ہوئے تھے۔ کہ بلا کے مشہور عالم حسین اور ان کا محیر العقول صبر، استقلال، حق روی پر باوجود ناقابل برداشت مصائب کے بڑھتا ہوا اصرار تسلیم و رضا کا کمال۔ یہ باتیں حسین میں روز عاشورہ دفعتاً نہ پیدا ہو گئی تھیں بلکہ ایک مائیکے اثرات کا نتیجہ تھیں۔ تربیت، توریث اور فضا تو مٹی ہی لیکن حسین بھی تھے جنہوں نے اصول کو اپنا کر لیا تھا۔ ہر انسان اپنے عمل میں مختار ہے، لیکن حسین جنہیں رسولؐ نے اپنا جوہر اور اپنی شجاعت عطا فرمائی تھی، انہوں نے جس طرح اور جن اسباب میں شہادت گوارا فرمائی اپنے کو اصول کا مجتہد قرار دیدیا تھا۔ ان کی شہادت ان امتام چیزوں کی شہادت تھی جو عالم، عرب، انسان اور اس کے اعمال و خیال میں بہتر ہے۔ اور اسی

شہادت کی نوعیت تھی جس نے حسینؑ کی جہانی فنا سے حسینؑ کی صفات کا ایک ایسا شخص قائم کر دیا جو ابد الابد تک فنا ہونے سے محفوظ ہو گیا۔ حسینؑ اپنی حیات میں تو ایک تھوڑی سی جگہ پر رہتے تھے، اب اُن کے تشخص کی سکونت اُس وقت سے آج تک کے مسلمانوں کے دل و دماغ میں ختمی اور ہر وہ قبل شہادت مدنیہ طیبہ میں سکونت پذیر تھے اب کوئی جگہ نہ جہاں مسلمان ہیں اور حسینؑ نہیں جہاں تاجِ ہرگز اور حسینؑ نہیں جہاں بولنے والے ہیں اور حسینؑ نہیں؟ نہیں بلکہ حسینؑ اور اُن کا ذکر، اُن کے خصائل کا ذکر زمانہ اور عالمِ اشیری میں ساری ہو گیا، کہاں نہیں ہیں؟ تمام عالم اُن کی درشاہ ہے، ہر شجاع دل اُن کا قہقہہ خواں ہے۔ اور ہر شریف اُنکا مدح ہے۔ کہ بلا میں تو صرف حسینؑ کی طرح مزار ہے، حیات اُنہیں ایسا جہم بسیط نہیں بنا سکتی تھی۔ کوئی قوم ہے جو حسینؑ کو اپنا بنا سکتی تھی اور نہ بنائی؟ تو میں تو اکثر فرضی اور مصنوعی شہدائیت ہیں اور مسلسل تحریک سے ایک فرضی تشخص کو حقیقی بھیس میں دکھاتی اور اُسے اپنے قومی اور سیاسی اغراض کے کام میں لاتی ہیں۔ ہمارا شہید عالم کا شہید ہے، اور اصول خیر اُس کی قربان گاہ ہے۔

کوئی قوم جو حسینؑ کو اپنا شہید کہ سکے اگر زبانی ادعا سے آگے بڑھ کر عملی حیثیت میں قدم رکھے، وہ اپنے قدم پر اپنی شجاعت کا ثبوت دے گی۔ وہ قوموں کی تندہ تنقیدی نگاہ کو مدعو کریگی اور دیکھنے دے گی کہ ہم غبار اور مخلوقات پر ایسے رحیم ہیں، متکبرین کے لئے ایسے بے حرکت ہیں، رضاے خدا پر اس طرح پیش قدمی کرتے ہیں، اصول کی اس طرح نگہبانی کرتے ہیں۔ اس طرح مخلوقات کو مسئلہ سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور جب یہ دیکھتے ہیں کہ یا اپنی جان اور دولت کی زندگی چاہو یا غربت کی موت مرو تو موت کی طرف اس طرح دوڑتے ہیں کہ اُس سے زیادہ کسی کی بغل گیری اور زیارت کا حوصلہ ہی نہ تھا۔

اخلاق کے طویل لیکچر آسان ہیں، اپنی بھڑوں کا گوشت کھا کر چربہ بار بائیں کرنا سہل ہے، عمل اُس سے بد رہا مشکل ہے۔ عمل کا اس قدر پاکیزگی خیال سے مضبوط ہو جانا کہ قابلِ جنبش نہ ہو، اُس سے مشکل ہے۔ خوبیوں کا عین خاصہ ہو جانا گویا انتہا ہے۔ پھر بھی

مرنا مشکل ہے۔ خصوصاً اپنے ذاتی تعلق کے لئے نہیں، اصول کے لئے۔ بات آسان ہوتی تو درجہ شہادت اپنی اس بلندی پر نہوتا۔ کچھ ہے جو ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ قوم کا یہ لفظ آماج خیال ہے۔ شہید وطن، شہید ملت اور شہید مذہب ہر ایک عزیز ہے، اور وہ غمزد ترین ہے جو ایک مجموعہ کی حفاظت میں شہید ہوا۔

کیا مجھے کہنا ہو گا کہ حسین کیوں شہید ہوئے؟ تفصیلی نہیں تفصیل بہت طویل ہوگی لیکن عرب کی دستی خصائل کے اشارہ سے میری کچھ غرض تھی، غرض یہ تھی کہ دستی خصائل کا درس جاری ہوئے ظاہر طور پر تتر بتر ہوئے تھے کہ اس میں نبی ہوئی قوم میں یہ تغیر ہوا کہ اپنے ہادی کا گھر کر بلا میں برباد کر سکتی۔ معمولی بتا ہی نہیں، نیست و نابود کرنے کا ویسا ہی ارادہ جیسا حسین میں اصول کی حفاظت کے لئے فنا ہو جانے کا مصمم غم تھا۔ تم جانتے ہو کہ دودھ پیتے اور تتلاتے ہوئے بچے بھی قتل ہو گئے۔ قوم کی حسان شناسی، رحم و کرم، انسانی حقوق کا لحاظ، مریضوں اور عورتوں کے ساتھ برتاؤ کے متعلق ہادی کی تعلیم کیا ہو گئی؟ - سیاسی دہم پر قربان کر دی گئی۔ اسی دن کے لئے رسولؐ نے قوم بنائی تھی، اسی دن کے لئے علیؑ نے سرکشان عرب کے سر کچلے تھے اور فتوحات کی طرف لے گئے تھے کہ جب تم مال و زر، حکومت و اختیار، سامان و آلات حرب پر قابض ہو جانا تو انہیں حسینؑ پر آزمالینا!

لیکن ایک قوم تھی جو تمام احساسات شرافت اور انسانیت کو قدموں سے روند سکتی تھی، اور حسینؑ کو اپنا شریک بنانا چاہتی تھی، تو وہ جسے ہادی کے تحت جگر کرنے دودھ پلایا تھا اپنی ایللی گردن اُن کے اعمال و خصائل کے خلاف احتجاج کے لئے بلند کرنے کو موجود تھا۔ میں اس شخص کی بات سنو گا جو یہ کہے کہ حسینؑ اپنی روش کے نتائج سے واقف نہ تھے۔ اسے جواب سننے کی ذمہ داری اپنے سر لینی ہوگی مختصر لفظوں میں حسینؑ کی حیات جن اوقات اور اسباب میں گزری تھی، اُن میں اپنے کو سمجھانے کی کافی صلاحیت تھی، اور وہ اس قدر مختلف انواع کے تھے جو اکثر انسانوں کے موقع اور اتفاقات سے بعید

تر ہیں۔ ایسے موقع اور اتفاقات میں کسی بشر، کسی شخص کے متعلق ایسا اعتراض کہ اُسے اپنے افعال کی نوعیت، اثر اور نتیجہ سمجھنے کا تجربہ نہ تھا ایک جبری تجاہل ہوگا، اور میں ایک مرتبہ اُس شخص کی صورت دیکھوں گا جو یہ کہے کہ حسین نے اپنے کو مملکت میں ڈالا۔ اُس وقت اس قدر سوال اور پس کہ اُس کے دفتر غیرت میں آیا کوئی امکانی وقت جان دینے کا ہے یا نہیں؟

حسین کے سامنے ایک قوم بنی تھی بہت کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، قوم گر کی طیش دل اپنے سینہ پر محسوس کی تھی، ہمدی کی زبان اپنے منہ میں دیکھی اور چوسی تھی۔ مرتے مرتے سینہ پر لوٹ لئے تھے، اپنے کانوں اور آنکھوں سے سنا اور دیکھا تھا کہ رسول ہمارے بارہ میں اُمت سے وصیت کر رہے ہیں، سنا تھا کہ جہنما دار، پدر عالی مقدار اور مادر گرامی میری شہادت پر راضی ہو چکی ہیں اور اب دیکھتے ہیں کہ وہ جو اُمت رسول کا عنان لیکر کہا جائے ایسا ہے جس پر انسانیت، اخلاق اور اصول کو شرم آئے، جس کی بعض بلکہ اکثر باتیں وحشیوں کیلئے باعث ننگ ہوں، وہ ہم سے اُس سے جس میں رسول کا اسم ہے بیعت کا اصرار کرتا ہے۔ بیعت، مخالفت نہ کرنے اور مطابعت کا عہد! جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے یعنی نواسہ رسول کے اقرار سے جانے والوں کو مشتبہ اور نہ جاننے والوں کے لئے اُن افعال کی تصدیق کرائے!

تو جس طرح حسین کا کر بلا والا شخص ایک زمانہ دراز کا عمل تھا، حسین کے مخالفوں کا ایسا ہونا جیسے وہ ظاہر ہوئے ایک زمانہ کے ہیجانِ عظیم کا نتیجہ تھا۔ میں خوش ہوں کہ اس مفید، باریک اور مغز پاش مطالعہ کو پبلک کا ورثہ قرار دے چکا ہوں۔ اس جگہ اس کے کہنے سے یہ غرض ہے کہ اب وہ دن پہونچا تھا کہ دینِ حسرت دیاس سے بقیہ اصحابِ عبا کی طرف دیکھ رہا تھا کہ تم اس عظیم شانِ مخالفت کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو یا نہیں؟ تم ایسا متموج پیدا کر سکتے ہو یا نہیں کہ لوگ عموماً جس رنگ میں رنگے ہیں اُس سے ہلکے

بھی کچھ دکھیں اور سوچیں؟ آیا تمہاری آواز اس قدر قوی ہے یا نہیں کہ تم بھی قاتلوں کے
کچھ کہہ سکو؟ اور الحق! حسینؑ کی قوت روحانی اور اُس کے عظیم الشان تغیر نے اپنے قاتلوں
سے کھلوادیا کہ ہمارا خزانہ، ملک، فوج اور اثرائت حسینؑ کے اُس تصفیہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے کہ
وان تکن الا بدن للموت انشاء

فقتل بالتیغ فی سبیل اللہ افضل

یعنی اگر انسان کے ابدان موت ہی کے لئے بنے ہیں تو راہِ خدا میں تلوار سے
مارا جانا افضل ہے۔

اور حسینؑ کے اُس گلوے بریدہ نے جس پر رحمۃ للعالمین کے بوسوں کی مہر تھی ایسی
صلہ بند کی جس نے خواہی نخواہی خلق اللہ کو اپنی مدح کا ہمزبان بنایا اور دشمنوں کو الہاب
کے لئے ذلت اور شرم سے دبا دیا۔

قوم کیوں ایسی ہو گئی؟ اس کی تشریح اس وقت میری زد کے اندر نہیں ہے۔
ز میں بہت سی مثالیں دوں گا، نہ صرف یہ مثال کافی ہے کہ سپہ سالارِ لشکرِ عشرہ مبشرہ
میں کے ایک کا لڑکا ہے، جس کی اور جس کے باپ کے جسم کی چربی اور شخصیت اُن کے گھر
نے بنائی تھی۔ قتل حسینؑ اور ملکِ رے کی حکومت کا موازنہ کرتا ہے اور قتل
حسینؑ کا تصفیہ کرتا ہے! خود غرضی، منفعت، نا احسان شناسی، حق و باطل کا عدم احسا
زر پرستی، حصول امتیاز، وہ کسی طرح ہوا اب اُس قوم کا خاصہ ہو گیا تھا جسے رسولؐ نے
ایثار، اور احسان شناسی، حق کی محبت، باطل سے نفرت اور بقولے سے درجہ امتیاز کا
سبق دیا تھا۔ اور اس سبق کو اُلٹا اُس پر صرف کیا گیا جس سے بڑھ کر کسی اور سے رسولؐ
کا ایسا قلبی تعلق دریافت کرنا مشکل ہے، اور روایت تو یہاں تک ہو کہ رسولؐ نے اپنے
فرزندِ ابراہیمؑ کو حسینؑ پر قربان کر دیا کس نے؟

حسینؑ منی وانا من آلحسین

نہیں سنا؟ کسے حق تھا بجز اُس کے جو رسول کا ریحان اور پھول تھا کہ وہ تعلیم رسول کی اُن
 اُن عظیم تشخص اور عمل کی خالص خوشبود دنیا میں پیش کر سکتا؟ کس کی زبان میں یہ قوت تھی جو
 ایک عالم کی مخالفت کے باوجود کہہ سکتا کہ تربیت یا جنگیان آغوش پاکیزہ عزت کی موت پر ذلت
 کی زندگی پسند نہ کریں گے۔ بجز اُس موتی کے جو اصلا ب بلند اور ارجام مطرہ سے منتقل ہو کر سونے
 کی گود میں آیا تھا اور زبان چوسی تھی؟

اپنا بہترین ہوش، شجاعت، استقلال، غور اور اندازہ صرف کرو اور دیکھو کہ اکیس ہزار
 تلواریں، تیر، نیزے، پتھر اور آگ ہے جس کی حیثیت پر بارش ہے، سپاہیوں کا دریا اور
 اُن کے جسم اور نفس کی مجموعی قوت ہے، ہیبت ناک شور اور ہر فرد ختم گھوڑوں کا حملہ ہے
 لیکن اُن سبے حیثیت کے اُس تنہا ہاتھ میں ریشہ نہیں پیدا کیا جو دین کے وقار اور اسکی
 لطافت کی نگہبانی کے لئے بلند تھا، وہ گردن نہیں جھکاؤی جس پر حسین کا سر تھا۔ وہ سر جو
 تمامی خوبی کا خزانہ تھا، جس پر قومیں مرنے اور وصلہ کرتی ہیں۔

اگر شہادت ہی کسی مذہب کی فضیلت کا معیار ہے تو ہم عالم سے چاہیں گے کہ وہ سلام
 کے اس شہیدِ عظیم کا ایسا کوئی شہید پیش کرے، اگر شہادت کسی قوم کے اعلیٰ عناصر کا ثبوت
 ہے تو ہم کہیں گے کہ لاؤ کوئی مقابل جو ہمارے اس اشرف الشرفا کے کارنامے کی روشنی
 کم کر دے، اور اگر شہادت ہی روحانی ارتقا کا ثبوت ہے تو ہم کہیں گے کہ لاؤ کوئی شہید جو
 اپنے آنے والے مصائب کے خیر مقدم کے لئے حیات کی طے پر حسرت و شوق سے بے چین
 ہو، جو تسلیم و رضا کا ایسا سبق دے گیا ہو کہ تیروں کے فرش پر آرام فرماتا ہے، جس کی
 زبان اقدس پر جاری ہے:-

”صبراً علیٰ قضائب یا رب لا إلهَ سِوَاكَ یا عِزَّاتِ المستغنیین“
 کیوں وجود خداوندی کے اثبات کے لئے فلسفہ کے متناقض مباحثہ میں اُبھتے ہو؟
 کیوں نہیں اُن بندوں کے اعتبار و یقین کو دیکھتے جنہوں نے خدا کی حقیقی حکومت قائم کی

درآخالیکہ اس سے انہیں کوئی دنیاوی نفع نہ تھا؛ وہ موحد بنکر کوئی دیا امتیاز حاصل نہیں کر سکتے تھے جو اعلان الحاد کا سافیشن ہو۔ حسین کے صفات کی تفصیل اسلامی تاریخ نہیں ہے مجھے مثالوں کی ضرورت نہیں، صرف یہ کہنا ہے کہ کوئی قوم جو بگڑ گئی ہو اور بننا چاہتی ہو، یا جو انفرادی دستی خصائل سے قومی تر قوم بنانا چاہتی ہو وہ حسین کے مدرسہ کی شاگرد ہو۔ یہ حسین تھے جنہوں نے اپنی مثال اور اہل بیت کی تعلیم سے لوگوں میں اُن کے ساتھ ہمدردی کا وہ ہیجان پیدا کر دیا جس نے بنی امیہ کی عظیم الشان سلطنت کو جناب کی طرح توڑ دیا۔

ہم جو مختلف فضا، اثرات اور قوموں کے مدارج نشوونما میں گھرے ہیں، ممکن ہے کہ اپنے انخطا اور زوال سے اور زیادہ گربائیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حسین روح اسلام کا پتہ دینے والے چراغ ہیں اور حسین ہی ہماری مژدہ بڑیوں کے لئے خرقیل ہو سکتے ہیں۔

بادستان تلافی!

حبیب ابن مظاہر رئیس کو ذمہ امام حسین کے بچپن کے ساتھیوں اور جاں نثار رفقاء میں سے تھے۔ بعض اور خاص احباب کی طرح انھیں بھی یہ شرف حاصل ہوا کہ مکہ سے چل کر راء عراق کی ایک منزل پر حضرت نے انہیں اپنے دست مبارک سے خط لکھا، اور خاص ایلچی کو ذمہ بھیج کر یاد فرمایا۔ حبیب خود اپنے آقا کی زیارت کے لئے بچپن تھے۔ حجاز سے حضرت کے آگے بڑھنے کی خبر مل چکی تھی لیکن کو ذمہ کی سمت تشریف لانے کا صحیح راستہ معلوم نہ تھا، اسلئے اب تک خوش بیٹھے تھے۔ آقا کا خط پا کر دگویا، شادی مرگ ہو گیا اور اُسی وقت تعلقات سے آزادی حاصل کر کے چل نکلے، اور حضرت سے جا ملے! عاشور کو جب سوا جنگ کے ہر راہ چارہ مسدود دکھائی دی تو ناچار امام حسین بھی مستعد ہرگ و جنگ ہو گئے۔ اس دفاع میں حبیب کا قدم نوجوانوں پر بھی سبقت لے گیا اور دشمنوں کا حملہ روکنے میں اس ضعیف العمر سپاہی نے سپر کا کام دیا!!۔

امام حسین کا اپنے دوستوں کے ساتھ کیا برتاؤ تھا، اور اس برتاؤ اور سچے خیال و بے ریا دل نے اُن کے جاننے والوں اور دوستوں کو کس قدر اُن کا گردیدہ و جاں نثار بنادیا تھا، اُس کی ایک مثال ذیل کی حکایت اور بندوں میں ملے گی، جسے تمامی دنیا اور خصوصاً مسلمان اور علی الخصوص اُس کی اُس مختص جماعت کو جو اُس عالی حوصلہ بزرگ کا نائب ہونے کی مدعی ہے! کو خوب غور سے دیکھنا اور پڑھنا چاہئے تاکہ وہ اپنے دلوں کو ٹٹول سکیں کہ اب حدیقت و سلوک کی کتنی گرمی اُن میں باقی رہ گئی ہے؟ اور حسین کا نام صرف زبان اور معمولی آنسوؤں کے ذریعہ سے جاری ہو رہا ہے یا واقعی اُن کی تعلیموں کا کوئی اثر بھی

اُن میں دکھائی دیتا ہے؟

حیدر کے بھی وہ سلوک اور خالص برتاؤ تھے، اور دراصل اسی میں وہ کرامت تھی جس نے ہزاروں کے مقابلہ میں اُن کے بہتر غواروں کو یوں کھرا کر دیا جس کی مثال دُنیا پیش کرنے سے قاصر رہ گئی! ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم اور وہ قوم جو اُس برگزیدہ ذات سے اپنے آپ کو وابستہ دکھلاتی ہے، اُس عالی نفس کی تعلیموں پر بھی غور کرے اور اپنے کو اُن کا سچا پیرو ثابت کر دکھائے۔

سب فوج کو سلام کا جب دے چکے جو ب بس جانبِ فرس متوجہ ہوئے جناب
روح الامین نے دی یہ صدا تھام کر رکھا ”بسم اللہ لے حدیو دماں مالک الرقاب
”نور محمدی - ریح النور کی ضو میں ہے“
”شوکت ترمی رکاب میں نصرت جلو میں ہے“

اس شان سے فرس پہ نہ اُن مہن چڑھے جس طرح نکلے ابر سے خورشید دن چڑھے
بہر جہاد راہِ حشدا مطمئن چڑھے گھوڑوں پہ نہ جوانوں سے پہلے سُن چڑھے

سب جاں نثاں سوار تھے راہِ ثواب میں
پیدل مگر تھے ابنِ مظلما ہر رکاب میں

بڑھتا تھا خونِ جوشِ شجاعت سے دمدم گردن میں وہ کمی تھی نہ مطلق کم میں خم
ہر نوجوان سے تھا یہ اشارہ - بعدِ خشم یعنی جہاں سے جائینگے پہلے جہاں میں ہم
بریں زہ - کمان کیانی تھی دوشیں پر
قبضہ یہ ایک ہاتھ تھا ایک نپ پونچ

ابو جھکے جو پرتے تھے آنکھوں پہ بار بار رد مال پھاڑ کر اُنھیں بانڈھا تھا استوار
آنکھوں سے شیرِ زکی جلالت تھی آنکھار گویا کہ تھی غلافِ حیدر کی ذوالفقار

سے حبیب ابنِ مظلما ہر رئیس کو فخر

جلدی پہلے جو چند قدم جھوم جھوم کے
رعشہ و دلع ہو گیا ہاتھوں کے چوم کے

اک شور تھا کہ رُعود کیا پھر شباب نے یا کی دعا حبیب کے حق میں خواب نے
دریش سفید رخ پہ سید کی تخاب نے دپائی یہ آب و تاب کہاں آفتاب نے

دلبریز نور سینہ بے کینہ ہو گیا،
یوں تھریاں میں کس تن آئینہ ہو گیا!

کہتے تھے باگ رو کے ہوئے شاہِ نامدا دیکھ کس لئے پیادہ دی لے خیفِ دُزار
”میں بھی اتر پڑو نگارہ نو کے اگر سوار!“ کرتے تھے عرض یہ کہ ”تو انا ہے جاں نشا“

”سرخسیر خستہ دل و ناتواں شدم“
”ہرگز نظر بروے تو کر دم جواں شدم“

فرمایا: ”تم کو دیتا ہوں اس سر کی قسم“ ”جو بعدِ عصر تیغ سے ہو جائے گا قلم“
”میں بھی نکالتا ہوں رکابوں کو قدم“ ”اچھا تمہارے ساتھ پیادہ چلیں گے ہم“

”چو چنیں خاں میں بحرِ مصیبت کو جھیل کے“
”ہم تم تو ایک گھر میں پہلے ساتھ کھیل گئے“

”وہ لوٹنا بھی خاک پہ۔ اب تک ہی یادگار“ ”تم پر بھی گرد تھی۔ مری زلفوں پہ بھی غبار“
”اس روز تم پہ مجھ سے سوا تھا بھی کیا پیار“ ”فرماتے تھے۔ یہ ہی مرے پیارے کا دوستدار“

”مشعبیر کے حبیب کو پہچانتا ہوں میں“
”لوئے گا یہ لمو میں یوں ہی جانتا ہوں میں“

رو کر کہا حبیب نے: ”آخر مواوہ دو“ ”اب اُن کا دور ہے کہ جو ہیں حاکم اُن جو“
”یہ وقت اور کچھ ہے۔ وہ ہنگام تھا کچھ اور“ ”مولا کبھی بد ما نہیں دُنيا کا ایک طوڑ“
”گردشِ نئی فلک کے نئے انقلاب ہیں“ ”دکوثر ہے جن کا۔ آج وہ محتاجِ آب ہیں“

یہ عرض کر کے روئے حبیب و فاشعار
 جہنگ کر کہا ”یہ میر غلام آب پر نثار“
 جہنگ سمند پر وہ دلاور ہوا سوار
 رو کے رہے کلامِ فرس - شاہِ نادر!
 ہر دوست پر پیر سے زیادہ شفیق تھے
 کیا قدردان وہ شاہ تھا اور کیا فریب تھے!
 (انیس)

با دشمنان مدارا!!

امام حسینؑ کو مذکی راہ میں ہیں مسلم و ہائی کی خبر شہادت اور یزیدی لشکر کے ادھر روانہ ہوئی خبریں برابر ملتی جاتی ہیں کہ یکایک ایک منزل میں ایک دشت فوج مل جاتا ہے۔ خوب جانتے ہیں کہ ان میں کا ایک ایک ہمارا دشمن جانی اور تشنہ خون ہے۔ لیکن ان کی مصیبت کا حال سن کر اور شدت عطش کی کیفیت معلوم کر کے رہ نہیں جاتا۔ اور قلب بے چین ہے۔ ان کی دشمنیوں کو اس وقت فراموش کر دیتے اور محض ان کے انسان اور بندہ خدا ہونے کو یاد رکھتے ہیں! حکم ہوتا ہے کہ دو ساتھ کا کل پانی انھیں پلا کر سیراب کر دو! عباسؑ اس عطا پر دبی زبان سے یہاں دلاتے ہیں کہ ”منزل سخت۔ راستہ پہاڑ۔ پانی کا قحط اور بچوں کا ساتھ ہے!“ مسکت جواب ملتا ہے کہ ”ہو۔ اصرار نہ کرو۔ یہ مسلمان ہیں۔ میرے بچوں کا خدا ہے!“ غرض وہ اندوختہ آب انھیں پر تقسیم کر دیا جاتا ہے! انسان سیراب ہو چکے ہیں تو حواہیوں کا حال دیکھا نہیں جاتا۔ بے زبان زبانیں نکالے ہوئے ہیں۔ اس پر قلب بھڑاتا ہے اور یہ حکم ہوتا ہے کہ ”ہاں۔ ان کی پیاس بھی بجھا دو!“ جانور بھی ٹھنڈے کئے جاتے اور ان میں تازہ جان ڈالی جاتی ہے! اس سو فرات کے بعد چین آتا ہے اور اب ان کے ادھر آنے کا اصل مطلب پوچھتے ہیں (ملاحظہ ہو روایت) یہ ہی ایک ہوا خواہ انسان اور ہمدرد بندگان خدا کا کیر کڑ! جس کے حالات و واقعات پر آنسو تو بہت بہائے گئے لیکن اب تک قلب میں وہ رقت و نرمی اور گداز پیدا نہ ہو سکا جس میں یہ کیر کڑ جذب ہو سکتا اور ہم انسان بن سکتے! دشمن کے ساتھ سلوک تو خیر اور انسان کے ساتھ ہمدردی تو دوسری بات، مسلمان مسلمان کے ساتھ کیا کرتے چلے آئے اور اب بھی کیا کر رہے ہیں؟

یہ دیکھنے اور بڑی عبرت کے ساتھ دیکھنے کی بات ہو۔ وہاں اُس حالت پر بھی وہ مسلمان سمجھے اور سمجھائے جا رہے ہیں اور یہاں پیشتر اپنی جماعت و دائرے سے خارج کئے جا رہے ہیں۔ اور بس نہیں کہ اُن کے ساتھ غلامانِ ترک دو عالم کا سالوک کیا جائے۔ اور اس پر بڑا ناز، اپنی عظیم فتح اور بڑی بہادری، اور اپنی بڑی بزرگی سمجھی جاتی ہو! ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلیٰ العظیم!!

اس زمانہ میں نگہداشتِ حیوانات اور مظالم بر حیوانات کا بڑا شور و غل ہو رہا ہے اور اس کے لئے سبھائیں، انجمنیں اور سوسائٹیاں بنائی جا رہی ہیں۔ اُن کے ہوا خواہ ذرا آئیں اور دیکھیں کہ وہی ہمدردِ بنی نوع انسان حیوانات پر بھی کس طرح نگاہ رکھتا اور اپنے نانا کی تعلیم اور اپنے باپ کی فرمائشوں (لا تجعلو بطونکم مقابر الحیوان۔ اپنے پیٹوں کو حیوانوں کا مقبرہ نہ بناؤ۔ یعنی اُن پر رحم کرو اور زیادہ گوشت نہ کھاؤ!) کو آج سے تیرہ سو برس قبل کس طرح پورا کر گیا، اور ایک اس واقعہ کو دیکھ کر سمجھیں کہ وہ واقعی پوجا جانے کا مستحق ہی نہیں مگر واقعی کوئی سمجھے کیونکر؟ کیونکہ کوئی سمجھانے والا نہیں! اس اذکار کرنے والے دل و زبان رکھتے ہوتے تو پہلے خود کو سمجھاتے، درست کرتے اور پھر دوسروں کے سدھارنے کا مسنہ رکھ سکتے تھے! فاعتبرو یا اولی الابصار!!

اکھڑے جو وہاں سے بھی خیاں مشر عالم خدام سے ارشاد کیا آپ نے اُس دم ”بچوں کی ہیں فکر ہے اپنا نہیں کچھ غم“ ”اُس منزل پر ہول میں پانی بہت کم“ ”شربے جو ہیں پر آب انھیں دنتوں پہ دھرا“ ”جو مشکیں کھالیں ہیں وہ سب پانی سے کھول“

یہ سن کے ہر اک مشک میں ستونے بھر آب راہی ہوا اُس بن سے نبی کا گل شاو آب گرمی یہ تھی اُس دن کہ کسی دل کو نہ تھی تاب تھا شعلہ فشاں وشت میں خورشید جہاں نوحل رہی تھی رنگ بھی سولای ہو تھے نجل میں گل فاطمہ مر جہاے ہو تھے!

حضرت بھی چلے جاتے تھے افسردہ و دلگیر
اُس شخص سے فرمانے لگے حضرت شبیرؑ
جو ایک لادرنے کسی گھوڑے پہ تکبیر
”بتلا سب اس ذکر کا۔ اے صاحبِ توقیرؑ“

کی عرض قریب آ کے شے عرض نیش کے
”وہ نخل نظر آتے ہیں کوفہ کی زین کے“
اور وہ نے یہ کی عرض کہ ”اے دلبر زہراؑ“
عباس علمدار نے جب غور سے دیکھا۔
”خرمے کے یہاں نخل تو دیکھے نہیں اصلاً“
کی عرض شہدیں سے کہ ”فوج آتی ہو مولاؑ“

”کیا جانے انبوه ہوا چاند نفس ہیں۔“
”لو کہیں یہ سانوں کی ہیں یا گوشِ فرس ہیں؟“

شبیرؑ نے فرمایا کہ ”سچ کہتے ہو بھائیؑ“
”ماتم میں کئی روز سے راحت نہیں پائی“
”یہ فوج ہمارے لئے کوفہ سے ہو آئی“
”کیا دو ہر گروہ اسی جنگل میں لڑائی؟“
”سرکش ہیں ارادہ نہ کریں بے ادبی کا“
”خیمہ کہیں برپا کر دنا موسیٰ کا“

یہ کیکے پھرے دھنی طرف سب طیمیرؑ
پہنچے تھے حرم خیموں میں ناقوں سے آتر کر
برپا ہوا نزدیکِ جبلِ خیمہ اطر
جو آگیا نزدیکِ ستمکاروں کا لشکر

سرتا قدم آہن میں جھاکار نہاں تھے
سب ایک ہزاران میں زرہ پوش ہواں تھے

آنے لگے حضرتؑ کی طرف جبہ جھاکا
عباسؑ یہ لٹکارے کہ ”بڑھو نہ خبردارؑ“
”برپا ہے یہاں خیمہ شہنشاہِ ابرارؑ“
”آئیں اوسے ہمیں بہرہ نہیں زہنہارؑ“

”کچھ عرض جو کرنی ہے تو کریجو ٹھہر کر“
”سردار جو آئے بھی تو گھوڑی سے آتر کر“

”بے خوف چلے آتے ہو باگوں کو اٹھائے!“
 ”کیا ہو جو ادھر سے بھی کوئی آنکھ دکھائے؟“
 ”پیغام ہی کچھ، یا ہو عریفہ کوئی لائے؟“
 ”تم سب میں جو فہیدہ و عاقل ہو وہ آئے،“
 ”گر بے ادب آؤ گے تو جاننا نہ ملے گا،“
 ”ہتھیار بھی باز نہ ہوئے آنا نہ ملے گا،“

”نئے عرض نہ معروض - نہ تسلیم نہ پیغام“
 ”تھرو وہیں بس! بد ہے اس آغاز کا بننا“
 ”کیا فوج یہاں کو فکی - اور کیا سپہ شام“
 ”کیتی کو آٹ دیں، جو بڑھیں تو لے سکھ“
 ”جنگل میں جو آتا ہے - وہ مختار زمین ہے“
 ”شیریں کا یہ بیشہ ہے - خبر تم کو نہیں ہے؟“
 ”گھر سمجھ ہو دربار شہنشاہ عرب کا؟“
 ”نئے پاس جلالت کا - نہ کچھ دہیان ادب کا“
 ”ہر چند کرم عام ہے اُس خاصہ رب کا“
 ”غصہ بھی نمونہ ہے مگر حق کے غصہ“
 ”ڈالو گے اگر رنگ لڑائی کی بن کا“

”صحرا ابھی بن جائے گا بازار حنا کا،“
 ”جنگل میں جو گونجا اسد بیشہ حیدر“
 ”دل پہنے لگے سینوں میں سب تم گنو“
 ”کس پیار سے شبیر پکارے کہ ”برلور““
 ”پوچھو تو ذرا کون ہے سرکردہ لٹ“
 ”آئے ہیں ملاقات کو - یا قصد و نغا ہے؟“
 ”مجھ پر بھی تو ظاہر ہو کہ منظور نہیں کیا ہے؟“
 ”یہ سن کے پکارا - اسد اللہ کا ضرغام“
 ”تم لوگوں کا سردار ہو کون اے سپہ شام؟“
 ”خود جوڑ کے ہاتھوں کو یہ بولادہ خوش انجام“
 ”سردار ہوں اس فوج کایں تحریر مرانام“
 ”دعویٰ غلامی ہے مجھے آلِ نبی سے“
 ”اب عفو ہو - محبوب ہوں اس بے ادبی سے“
 ”حاکم کا یہ جنگی ہے رسالہ مرے ہمراہ“
 ”نے دابے واقف ہیں - نہ آداب سے آگاہ“

”بس غیظ نہ فرمائیے۔ بہرِ شہِ دیجاہ“ ”اب غیر اجازت نہ بڑے گا کوئی سوا اللہ“

”ہے عفو و ترحم کا رولج آپ کے گھر سے“

”تقصیر بھی ہو جاتی ہے دنیا میں بہرِ شہ“

”بہرِ شہ نے بصدِ عجزِ یہ تقریر سنائی“ ”شہ بولے۔ ”مرے سر کی قسم جانے دو بھائی“

”وقتِ اجازت خردیندار نے پائی“ ”خود بھی بہ ادب آگے بڑھا۔ فوج بھی آئی۔“

”دیکھا جو شہنشاہ کے اقبالِ دشتم کو

”مجھ پر کیا صاف باندھ کے سلطانِ اُمم کو

”دیکھ کے فرمانے لگے شاہِ خوش اقبال“ ”کیا وجہ جو تم لوگ ہو سب مضطرب الحال؟“

”اب عرض یہ کی خضر نے کہ“ ”اے فاطمہ کے لال“ ”بتیاب ہیں سب باہی بے آب کی تمثال“

”آہوں کا دھواں اٹھتا ہے پیاسوں کے گلبرگ“

”قطرہ نہیں پانی کا ملا تین پہر سے؟“

”وہ گئے پانی کی تجسس میں ہوا خواہ“ ”جز خاک نہ چشمہ کمیں دیکھا۔ نہ کمیں چاہ۔“

”اے سوہیں سوارِ انِ عراقی مرے ہمراہ“ ”بے موت موعے جاتے ہیں سب یا شہِ دیجاہ؟“

”اب جان نہ گھڑوں میں۔ نہ ہواؤں میں میری

”لے ساقی کو نثر کے سپرد وقتِ کرم ہے؟“

”سنتے ہی بتیاب ہوئے سب بطِ پیغمبر“ ”دیکھا رخِ عباسؑ کو۔ اشکِ آنکھوں میں بھر کر“

”فرمایا کہ۔ ”یہ لوگ ہیں سب پیاس کے مضطرب“ ”جو ساتھ ہو پانی ابھی لے آو برادر!“

”بھتی! اکرا بکھولیو۔ پیاس ان کی بھٹکے“

”میں کانپ رہا ہوں کہ یہ بند ہیں خدا کے“

”عباسؑ نے کی عرض کہ۔ ”اکو کل کہہ دیکھا“ ”کیا طاقت و قدرت جو کروں حکم میں تکرار“

”پر مصلحتاً عرض یہ کرتا ہے تمک خوار“ ”اطفال ہیں ساتھ آپ کے یا سیدِ ابراہ!“

”مولاکئی فرسخ ابھی جانا ہے یہاں سے“

ہانگیس گئے وہ پانی۔ تو پھر آئیگا کہاں سے؟

فرمایا ”مرے سر کی قسم کچھ نہ کمو اب“
”میری یہی مرضی ہے کہ سیراب ہوں یہ
انسان کا انسان سیروا نہ تو مایہ طلب
میرجائیں مسلمان۔ یہ کوڑا ہی مجھے کب

میں مالک کوثر ہوں زرد دہنیں تکیا ہے؟
”بیاس انکی بھادو مرے بچوں کا خدائے“

یہ سنتے ہی ستوں کو عسکر ارکارے
”جو پانی ہے اے آؤ دھسب۔ پاس چارے“
ستے جو تھے سرکار کے حاضر ہوئے تاسے
مشکیزے بھی ناتوں سے بہ تعجیل اُتارے

ہاتھوں میں کٹورے زلفا شہ کے لئے تھے
ستوں نے پکھانوں کے دہن کول دیئے تھے

مصروف ہوا خود سپر ساقی کوثر!
پیا سوں کو عطا ہونے لگے پانی کے سیاغ
تقسیم ادھر کرتے تھے عباس دلاور
پیا سوں کو ادھر دیتے تھے پانی علی گہر

ہر لب پہ سخاے شہ والا کا بیاں تھا
دریائے کرم ساقی کوثر کا رواں تھا

چلاتے تھے ستے یہ کٹوروں کو جب اکر
”جو فوج میں پیاسا ہو۔ وہ پانی پئے آکر“
”بیخ ہو گیا ہے آب۔ ہوا دشت کی کھا کر
”گرمی میں جگر سرد کرے پیاس ٹھجا کر“

”یہ مشک ہر اک چشمہ شیریں بھری ہے“
”کوثر کا جو مالک ہر سبیل اُس نے دھری ہے“

سب ہو چکی سیراب جو فوج حُر دیندار
”عباس سے زمانے لگے سید ابرار“
”منصط نہیں زبانوں کو نکالے ہو کر ہوا“
ہاں۔ انکو بھی سیراب کرو لے مئے غمخوار
”جیوانوں کا بھی قافلہ مغموم نہ رہ جائے“
”یہ گھوڑی سختی کا۔ کوئی محروم نہ رہ جائے“

ستوں کو لئے ساتھ بڑے حضرت عباسؓ
 ہاتھوں میں لگن کوئی لئے تھا تو کوئی تاس
 اسواروں کو جن گھوڑوں کی بچنے کی تھی
 جاں آگئی ان تازیوں نہیں جبکہ بھی سیا

جوانوں کا یہ پاس تھا جس شاہِ اہم کو

پانی نہ ملا تین دن اُس بھر کرم کو!

(انیس)

رباعیاتِ شہیر

(از جنابے لوی سید محمد نوح صاحب دین مچھلی شہر)

جس فرقہ میں جوہی، اس کا یہ ہی نظرون
قرآن میں ہو شہیر! حق، حق کا یہ قول
نیشیا رہیں ہیں، غیر سب ہیں مجنون
کل حزب بمالکدھم فوجون

نقد امیں ہو حرف گولا کھڑا
کھڑے من قلم قلیلی کے آگے
جو میں گے مگر نہ ہم حشر کا ارشاد
غلبت قلم کثیر ہے ہیں یاد

تا ہونہ رجوع قلب پیچے جی سے
دل اور طرف ہو رخ ہو سوے کعبہ
قربت ہوگی، نہ حق کی نزدیکی سے
کیا نفع منازا، اس اٹھا بیٹھی سے

ہر خد میں قائل ہمہ دوست نہیں
رگ رنگ میں ہو، لمو میں گرمی اس کا
لیکن کوئی شے بغیر از دوست نہیں
بے خون نہ گوشت، گوشت بے پوست نہیں

اسلام غریب ہو، غریب الوطن، آہ!
طوفانِ حوادث ہو، تلاطم ہے عظیم
ہے قوم کا حال ہند میں آ کے تباہ
بڑے کا ہمارے ہے محافظ اللہ

خاموش ہوں کوئی مراد ساز نہیں
آواز بھی ہو تو کب ہے اندازِ کلام
وہ ساز ہوں میں کہ جس میں آواز نہیں
گویا ہوں مگر سخن کا انداز نہیں

ہر خد ضعیف و پیکار ہوں میں
مٹنے کو ہے یہ نمود بے بود شہیر
اجاب کو اپنے پھر بھی پیارا ہوں میں
پیری میں بھی صبح کا ستار ہوں میں

